مولانا معین الدین اجمیریؒ

کردار و افکار

مولانا حکیم محمودؒ احمد برکاتی

برکات اکیڈمی کراچی

حکیم محمود احمد برکاتی کی دوسری تالیفات

قرابادین برکاتی (زیر طبع)
سفر و تلاش (مجموعہ مقالات)
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان
فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون
حیات شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی
اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان (ترجمہ)
الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود (ترجمہ)
مولانا حکیم سید برکات احمدؒ سیرت و علوم

برکات اکیڈمی کراچی

۲۹۸-اے ،لیاقت آباد نمبر ۴،کراچی ۷۵۹۰۰

مولانا معین الدین اجمیریؒ

کردار و افکار

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی کراچی
۲۹۸۔ اے لیاقت آباد نمبر۴ کراچی

کتاب — مولانا معین الدین اجمیری افکار و کردار

مؤلف — مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

ناشر — حکیم مجاہد محمود برکاتی، برکات اکیڈمی

۹۸/۲-اے، لیاقت آباد نمبر ۲، کراچی ۷۵۹۰۰

فون ۴۱۸۱۰۰

اشاعت — دسمبر ۱۹۹۳

ملنے کا پتہ — برکاتی دواخانہ

عرفان کلاتھ بلاک نمبر ۷، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۷۵۹۵۰

فون ۶۳۱۸۹۲۵، ۶۳۲۸۳۱۳، ۶۳۳۲۸۹۳

طابع — احمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی

قیمت — پچاس روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج سے ۲۶، ۲۷ سال پہلے برادر محترم مولانا حکیم محمد نسیم الدین ندوی (نظامی دواخانہ، کراچی) کے حکم سے جب میں نے مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات ترتیب دیئے اور انہیں معین المنطق کے نام سے شائع کیا جانے لگا تو اس کی ابتدا میں مولانا مرحوم کے افکار و کردار پر بھی ایک مقالہ لکھ کر شامل کیا تھا۔

اسی وقت سے بکثرت احباب یہ تجویز کرتے رہے کہ اس مقالے کو مستقلاً شائع کیا جائے۔ معین المنطق کی اشاعت اولی کے نایاب ہونے کے بعد اس تجویز میں مخصوص وزن پیدا ہو گیا ہے اور آج یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مقالہ میں کئی فصول کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن اب بھی کئی فصول کے اضافے کی ضرورت ہے تاکہ اسے ایک مکمل حیات بنایا جا سکے۔ ۲۷ سال پہلے کی اس تحریر میں کئی مقامات پر جزوی ترمیم و تغیر کی بھی ضرورت تھی مگر اسے بھی آئندہ اشاعت پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔

ابتدا میں علامہ سید سلیمان ندوی کا وہ مضمون شامل کر دیا گیا

ہے جو انہوں نے مولانا مرحوم کی وفات پر "معارف" میں تحریر فرمایا تھا۔

امت مرحوم کے سرفروش رہ نماؤں اور علوم دین کے ان اخلاص شعار اور نیک طینت خادموں کی داستان سرائی کو میں اپنی نژاد نو کی ایک اہم خدمت تصور کرتا ہوں ۔ موجودہ حالات اور عہد حاضر کے دینی وسیاسی رہنماؤں نے اسے مایوسی کی تاریکیوں میں دھکیل دیا ہے، مولانا معین الدین کے حالات پڑھ کر انہیں پتہ چلے گا کہ ماضی قریب میں ملت میں کیسے کیسے اکابر گزرے ہیں ۔ ریاضت ومجاہدہ عزم واستقامت، بے باکی حق گوئی، فقر وفاقہ میں شان کج کلاہی، علوم دین اور طالبان علوم دین کی مسلسل و بے مزد خدمت، استخلاص وطن کے لئے تحمل شدائد جن کی حیات کے عنوانات جلی اور ہمارے لئے اسوہ نمونہ ہیں۔

اگر در خانہ کے دست یک آواز بے ست

طالب علم محمود احمد برکاتی

تقریظ

مولانا حکیم محمد نصیر الدین ندوی

ہمارے مخدوم و کرم گستر مولانا حکیم محمود احمد صاحب دامت برکاتہم نے حضرت مولانا معین الدین صاحب مرحوم مغفور کے سوانح حیات بہترین ترتیب کی ساتھ قلم بند فرمائی ہیں حکیم محمود میاں اپنے اسلاف تاریخ کی بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں اور ان کے حقیقی کمالات اور علمی سربلندیوں کا حال تفصیل سے لکھ چکے ہیں حکیم محمود میاں بایں معنی تاریخ کے عظیم ترین آدمی ہیں کہ انہوں نے اکابر واعلام کی سرسری تاریخ نہیں لکھی ہے بلکہ ان کے حقیقی کمالات کی نشان دہی کی ہے ان اسلاف کے انداز نگارش میں بڑی باریکیاں تھیں جنہیں باریک بین حضرات ہی حل کر سکتے ہیں محمود میاں قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ان بزرگوں کے علوم کو بھی متعارف کروایا ہے۔

ایک مجاہد عالم اور درویش

از

علامہ سید سلیمان ندوی

۱۰ محرم الحرام ۱۲۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم و عمل فضل وکمال مجاہدہ و استقامت اور تقویٰ و طہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصہ دراز تک خالی رہے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ ارتحال ہے! یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانان اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متاثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے۔

وما کان قیس ملکه هلک واحدا
ولکن بنیان قوم تهدما

مولانا ایک نو مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ والد ماجد

مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نو مسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخل اسلام ہوئی تھیں اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا۔ تعلق راجپوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم ریاست ٹونک میں سکرٹری کونسل تھے چار پانچ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) میں ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوئے اور باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں۔ بچپن ہی سے سعادت وفیروز مندی کے آثار نمایاں تھے۔ چنانچہ دولت وثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی، امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا۔

معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب سے ہوئی علم ریاضی مولانا حضرت لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا۔ بائیس سال کی عمر میں علوم میں ایسا رسوخ ہوگیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے۔ اسی وقت سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ واقعہ یہ

ہو کر مولانا عبدالحق صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا۔ آریوں کی طرف سے پنڈت داشانند جی بحث کر رہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے۔ تین دن سے سلسلہ جاری تھا جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے روح، مادہ، پرمیشر کی قدامت کے سلسلے میں حدوث وقدم کی طویل بحث کو اس طرح سے بیان فرمایا کہ صرف سات منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہو گئے اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہو گئے۔

ڈھائی سال تک مدرسہ نعمانیہ میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۱۳۲۷ھ، ۱۹۰۹ء میں مدرسہ معین الدین قائم کیا۔ سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اس کے لئے جاری فرمایا۔ مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا۔ ۱۳۳۷ھ میں کار پردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا چنانچہ

انہوں نے استعفا دے کر محرم ۱۳۳۷ھ، ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا اور بارہ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا۔ ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے۔ لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے۔ لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقہ درس پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہا۔ اس زمانہ میں درس وتدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی شامل رہے۔ چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا۔ مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ وجود علم و معلوم، کلی طبعی اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں حضرت خواجہ غریب نواز کی محققانہ سوانح عمری وغیرہ۔ یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی اس وقت ان کو معلوم ہو گا کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانہ میں درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتویٰ مولانا نے مرتب فرمایا تھا وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تائید کی اور دوسری طرف

ممبران اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی، عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا اسلامی نقطہ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود چند در چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریک خلافت میں فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لئے۔ جس زمانہ ابتلا میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت العلما اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیت العلما کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں کے سوا برادران وطن میں بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیہ

باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔ مولانا کے والد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے۔

استغنا رجوع الی اللہ توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے۔ فرائض تعلیم و افتا اور رشد و ہدایات کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلا ضرورت نہ ٹھہرتے، ارباب وطن اہل دنیا خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق کا خاص اثر لے کر واپس جاتا۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے۔ تادم واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا۔ حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے۔ اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دو چار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیئے۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ

عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں "یا ابتاہ!" (اے میرے باپ) سرکار دوعالم نے فرمایا" لا کرب علی ابیک بعد الیوم " (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے، آنسو نکل جاتے، چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے ہونہار طالب علم مولانا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا۔ ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا۔ اس جلسہ میں ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا، مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے۔ بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف سے مولانا بھی ہوتے، آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ ڈیڑھ سو روپے مشاہرہ پاتے تھے، لیکن تیس روپے ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ کے

سامان تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے اور خواہ دوگنی چوگنی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ مگر بہتر نسخہ خریدتے۔ قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے۔ کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے۔

۵ محرم الحرام ۵۷ھ کو ایسے بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے۔ دل و دماغ البتہ صحیح رہے اور اس حالت میں بھی سلسلہ درس و تدریس جاری رہا۔ وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔ زندگی ہی میں عرصہ دراز سے گور غریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا، جس کی تکمیل دارالعلوم کی اس رقم سے ہوئی جو کمیٹی نے بطور اعتراف خدمات مولانا کو پیش کی تھی۔ اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا۔ ہزارہا مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئی تھیں۔ بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیے رہے تھے۔ پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ دفن ہوئے۔ قبر میں اتارتے وقت در و دیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم

تھا۔ پسماندگان میں ۲ بچے، مولوی عبدالباقی اور ایک صاحبزادی اور ایک بیوہ ہیں۔ اجمیر کے قیام کی مدت ۲۴ سال ہے اور کل مدت حیات ۶۰ سال ہے۔

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ واقعہ کربلا سے سوگوار تھے اس شہید علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا اور اجمیر میں اہل دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔

علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ

کردار و افکار

خاندان

مولانا کے والد مولوی عبدالرحمن صاحب بلیا کے ایک راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان شہنشاہ اکبر کے کسی رتن کی نسل سے تھا اور اس وجہ سے ایک بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ مولوی صاحب اپنے والد کے تیرہویں لڑکے تھے، نام تھا "شیودت سنگھ چہارم" اس خاندان کے سب بچوں کی تعلیم اس دور کے تمام شریف ہندو گھرانوں کے بچوں کی طرح مسلمان اساتذہ کے سپرد ہوتی تھی۔ ان کے لیے جن معلم کا تقرر کیا گیا وہ نرے معلم و مدرس نہیں تھے بلکہ دعوتی ولولہ بھی اپنے اندر رکھتے تھے۔ اس کمسن راجپوت شاگرد کو وہ اگرچہ اردو اور فارسی کا مروجہ نصاب پڑھاتے تھے مگر اپنے حسن عمل

اور انداز مو عظمت کے جادو سے شرک سے متنفر اور توحید کا قائل بناتے چلے گئے اور بالآخر اس نوخیز رئیس زادہ کا درون تیرہ نور ایمان سے روشن اور اس کے لب کلمہ طیبہ سے تر ہو گئے۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم! چھپ چھپ کے نمازیں بھی پڑھی جانے لگیں اور مشرکانہ رسوم وآداب سے اجتناب بھی ہونے لگا، بات پھوٹ گئی، خوشبو پھیل گئی اور شیودت سنگھ کے عبدالرحمن بن جانے کی خبر عام ہوئی تو عبدالرحمن کے لیے ان عباد طاغوت کے ماحول میں رہنا دشوار ہو گیا اور یہ اپنے گھر سے نکل کر سیدھے اجمیر آگئے۔ یہاں خواجہ بزرگ کی درگاہ کے ایک حجرہ میں قیام کیا اور حصول معاش کے لیے مسلمانوں کے بچوں کی معلمی کو ذریعہ بنایا۔ خالی اوقات میں جھالرہ سے مشکوں میں پانی بھر بھر کر زائرین کو پلاتے رہتے تھے۔ اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا۔

اجمیر کے اس دور کے ایک معزز مسلمان خان بہادر ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم ایک نوجوان کو اس طرح معلمی وسقائی کرتے دیکھتے تھے ایک روز انہوں نے اپنے گھر لے جاکر حالات دریافت کیے۔ مولوی عبدالرحمن صاحب نے اپنے خاندان کا پتہ دیا تو ڈاکٹر الٰہی بخش جو اصلاً

پوربی ہی تھے ان کے گھرانے اور اس کی دولت وحشمت اور مقام ومرتبت سے واقف نکلے، متعجب ہوئے اور اپنی بھتیجی کے لیے اس صالح، باصفا اور سعید فطرت نوجوان کا انتخاب کر لیا۔ سنت ابراہیمی ادا کی گئی اور مولوی عبدالرحمن اب مسلم معاشرہ کا ایک فرد بن گئے۔

عائلی زندگی کے آغاز اور ذمہ داریوں کے بڑھنے کے بعد غالباً ڈاکٹر الٰہی بخش کی سعی ہی سے مولوی صاحب ریزیڈنسی کے محکمہ پنچایت میں مترجم فارسی کی حیثیت سے ۷۵ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے یہاں اپنی فرض شناسی اور حسن کارکردگی کی بنا پر ترقی مناصب پاتے رہے۔ مشاہرہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس زمانے میں ریاست ٹونک کے اسٹیٹ کونسل کے لیے سکریٹری کی ضرورت ہوئی تو ریزیڈنسی سے دو سو کلدار ماہانہ مشاہرہ پر ریاست نے مولوی صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس وقت سے آخر عمر تک مولوی صاحب ٹونک ہی میں رہے۔

منصبی فرائض کے علاوہ مولوی صاحب اپنے ملی فرائض سے بھی غافل نہیں رہے۔ چنانچہ ان کے حبیب ورفیق مولانا سید برکات احمد نے جب اپنے گرد طلبہ کے ہجوم کی وجہ سے اپنے معاونین کی ضرورت محسوس کی اور ایک باقاعدہ درسگاہ جاری کرنا چاہی تو مولوی

صاحب ان کے شریک کار اور معاون خاص رہے اور دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ کے قیام و نظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا مدرسہ کی مجلس منتظمہ کے معتمد رہے۔

ٹونک میں مولوی صاحب کا حلقہ احباب، حکیم صاحب کے علاوہ صاحبزادہ عبدالرحمن خاں، بسمل خیرآبادی، مرزا محمد علی خاں دھلوی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ان حضرات کی شائستہ و بے تکلف محفل آرائیوں کی داستان لذیذ بھی ہے، مگر "دراز تر گفتن" کی گنجائش نہیں ہے۔

مولوی صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی جگہ ہم ان کے چند لطائف درج کریں گے۔

مولوی صاحب نے دینیات اور طب کی چند کتابیں اپنے فرزند سعید مولانا معین الدین اجمیری سے (جبکہ وہ خود تعلیم کے آخری مراحل طے کر رہے تھے) پڑھی تھیں۔ مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی سے بیعت تھے۔ ۱۹۱۱ء میں وصال ہوا اور "مقبرہ، حکیم دائم علی صاحب" میں حکیم سید برکات احمد کے پہلو میں محو استراحت ہیں۔

مولوی عبدالرحمن صاحب نے متعدد شادیاں کیں جن سے چار فرزند تولد ہوئے۔

۱۔ علامۂ اجمیر مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ شفاء الملک مولوی حکیم حاجی نظام الدین اجمیری، ف

۳۔ مولوی محی الدین غازی اجمیری، ف ۱۹۷۰ء

۴۔ غلام محمد صاحب، متوفی ۱۹۳۲ء

ولادت

مولانا ۲۵۔ صفر ۱۲۹۹ھ، مطابق ۱۸۔ دسمبر ۱۸۸۱ء کو دیولی کیمپ (راجپوتانہ) میں تولد ہوئے جہاں ان کے والد ماجد بسلسلہ ملازمت متعین تھے۔

تعلیم و تربیت

۱۸۸۵ء میں رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور یوں چار سال کی عمر میں اس امیرزادہ نے طلب علم کے اس سفر کا آغاز کیا جو آخری ساعات حیات ظاہری تک مسلسل ۵۶ سال جاری رہا۔

کلام اللہ ٹونک کے ایک مشہور حافظ مرتضیٰ سے پڑھا۔ حساب کی تعلیم اس دور کے ایک فقید المثال ماہر ریاضی منشی مصطفیٰ صاحب (۱) سے حاصل کی۔ اردو فارسی کے مروجہ نصاب درس (۲) کی تکمیل میں چند سال صرف ہوئے پھر درس نظامی کے ابتدائی مراحل مولوی

مفتی سید احمد مجتبیٰ صاحب اور مولوی نصیر احمد صاحب پھلتی، مولوی حکیم مفتی خلیل الرحمن میر نگری مرحوم وغیرہ سے ملے کئے اور تقریباً پندرہ سال کی عمر میں مولانا حکیم سید برکات احمدؒ سے تعلیم و استفادہ کا آغاز کیا۔

مولانا کو حکیم صاحب سے پہلے سے قربت و نسبت تھی، ان کے والد ماجد مولوی عبدالرحمن صاحب اور حکیم صاحب کے درمیان خلت واخوت کے مستحکم روابط تھے۔ ان حضرات کے اخلاص و محبت کی داستانیں سنانے والے چند سال پہلے تک زندہ و موجود تھے۔ اس تعلق کے علاوہ مولانا ایک ذکی و فطین طالب علم اور جوہر قابل تھے، ابتدائی کتابیں فضلائے (۳) وقت سے نکال چکے تھے، اور اب طلب علم کی اس منزل میں تھے جب آتش شوق و طلب خوب فروزاں ہو جاتی ہے اور آدمی بلانوشی پر اتر آتا ہے اور جام و ساغر کی تنگ ظرفیاں اس کے عطش مفرط کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگتی ہیں اور

بھڑاوے منھ سے منھ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ادھر حکیم صاحب ابھی خود جوان سال و جواں ہمت تھے۔ ماضی قریب ہی میں علامہ عبدالحق خیر آبادی اور قاضی محمد ایوب صاحب محدث بھوپالی جیسے یگانہ عصر اور یکتائے جہاں امامان معقول

و منقول کے چشمہ ہائے فیض سے سیراب ہو کر آئے تھے، جو کچھ فاضل اساتذہ سے حاصل کر چکے تھے، وہ قابل تلامذہ تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ جو امانت ان تک پہنچائی گئی تھی وہ مستحقین کو سونپ دینا چاہتے تھے۔ شوق تھا، ولولہ تھا، پھر "معین الدین" ایک محنتی طالب علم اور جوہر قابل ہی نہیں، برادر زادہ (ایک محب صادق کا فرزند سعید) بھی تھا۔ اب تصور کیجئے، دینے والے نے دینے میں کیا کمی کی ہوگی اور لینے والے نے لینے میں کیا کوتاہی روا رکھی ہوگی، پلانے والے نے خم کے خم الٹ دیئے ہوں گے اور پینے والے نے جی بھر کے داد مے کشی دی ہوگی۔

ادھر عقلی فنون کے وہ تمام اسرار و نکات بے نقاب کر دیئے گئے ہوں گے، جو حکیم صاحب نے مسلسل پندرہ سال خیر آبادی علامہ کی درسگاہ سے حاصل کئے تھے۔ بارگاہ رسالت و آستانہ نبوت کے علوم و معارف کا وہ تمام سرمایہ استاد نے اپنے سینے سے سعید و رشید شاگرد کے سینے میں انڈیل دیا ہوگا جو انھیں بھوپال کے ولی اللہی محدث کے وسیلے سے تھا۔ معانی، بیان، بدیع، منطق، کلام، طبیعیات، الٰہیات، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث و سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ تمام کتابیں مولانا نے پڑھیں جو درس نظامی (۴) میں داخل تھیں، پھر وہ تمام کتابیں ختم کیں جن کا اضافہ خیر آبادی درس

میں کیا گیا تھا - جواہر الغالیہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ مولانا عبدالحق، شفا، الافق المبین، اشارات، شرح مواقف، ہدیۃ الھدیہ، شرح سلم بحر العلوم، میرزاہد امور عامہ، شمس بازغہ، قدیمہ جدیدہ، شرح مرقات، حاشیہ قاضی مولانا فضل حق، حاشیہ قاضی مولانا عبدالحق، صدرا، تلخیص الشفا، غرض کلام وعقائد طبعیات والٰہیات میں قدما و متاخرین فلاسفہ ومناطقہ ہند وایران وخراسان وماوراء النہر کی وہ کتابیں بھی پڑھیں جو مطبوعہ وشائع اور دوسرے سلاسل میں تھیں، وہ کتابیں بھی پڑھیں جو صرف خیرآبادی درسگاہوں کا طغرائے امتیاز تھیں اور وہ کتابیں بھی پڑھیں جو برکاتی مکتب کلام وتصوف کے مختصات میں محسوب کی جاسکتی ہیں اور جن کے نسخے کم سے کم اس نواح میں صرف حکیم صاحب کے کتب خانے کی زینت تھے - ایسی ہی نادر الوجود کتاب غالباً حاشیہ الافق المبین (۵) کے درس کی کیفیت بروایت غازی صاحب یہ ہوتی تھی کہ کتاب کا مخطوطہ جو صرف حکیم صاحب کے کتاب خانہ میں تھا" دوروز کے لیے مولانا کو دیا جاتا تاکہ وہ ہفتہ بھر کے درس کے بقدر اس کا مطالعہ کرلیں - مخطوطہ حکیم صاحب گھر سے خود لے کر باہر تشریف لاتے اور بہت اخفا کے ساتھ اہتمام اخفا کی تاکید کے ساتھ ہر ہفتہ مولانا کو دیتے - مولانا اس کو چھپا کر گھر لے جاتے، پہلے

اس کا ایک ہفتہ کے درس کے بقدر مطالعہ کرلیتے پھر (حکیم صاحب کی اجازت کے بغیر اور ان کی ہدایت کے علی الرغم) ایک زود نویس کاتب کو گراں قدر معاوضہ دے کر اس کی نقل کروالیتے اور موعود ومقرر وقت پر حکیم صاحب کو واپس کرآتے تاکہ حکیم صاحب بھی درس کے لیے اس کا مطالعہ (۶) فرمالیں" -

ہائے، کہاں گئے وہ زمانے، کہاں وہ پڑھانے والے اور وہ پڑھنے والے ! ---- اب تو یہ فنون ہی اس زمانے کے لیے اجنبی ہوگئے - پھر ان فنون کی بھی نصابی کتابیں بلکہ خارج از نصاب کتابیں پڑھانے اور پڑھنے کا وہ ذوق اور جذبہ کہاں سے آئے - ذوق بھی تھوڑا بہت نہیں، حد سے بڑھا ہوا "جنون" کی حد تک پہنچا ہوا -

علم کے ذوق نے کتابوں کی محبت دل میں پیدا کی، کتابوں کی محبت نے ان کے حصول کی خواہش اور حفاظت کا جذبہ بیدار کیا - استاد کو کتاب حاصل ہوگئی تھی تو وہ اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتے تھے - ان کا بس چلتا تو وہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے - مگر ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مولانا معین الدین جیسے ہونہار طالب علم کو حاشیہ الافق المبین نہ پڑھاتے اور پڑھانے کی واحد صورت یہی تھی کہ کتاب مطالعہ کے لیے ان کو بھی دی جائے -

اب مولانا معین الدین کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ حاشیہ الافق المبین ہاتھ آئے وہ صرف مطالعہ کرکے واپس کر دیں نقل (۷) نہ کرلیں۔

در مکہ بدزد اگر بیابی!

حکیم صاحب اگر مولانا کو کتاب نہ دیتے تو ان کی جوہر شناسی محل نظر ہوتی اور مولانا اگر بغیر نقل کئے کتاب واپس کر دیتے تو ان کے ذوق کی خامی ہوتی۔ "عشق کی ناپختگی" ہوتی، "قدر ناشناسی" ہوتی۔

ز نقص تشنہ لبی داں بعقل خویش مناز

دلت فریب گراز جلوہ، سراب نخورد

دوران تعلیم ہی میں مولانا کے والد مولوی عبدالرحمن صاحب نے ان سے طب کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ تاریخ درس وتدریس کا یہ بھی ایک نادر واقعہ ہے کہ باپ بیٹے کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرے مگر ہم نے زانوئے تلمذ تہ کرنا عام محاورہ کی بنا پر لکھ دیا ورنہ یہاں صورت برعکس تھی۔ سعید ورشید بیٹا باپ کے سامنے پڑھاتے وقت بھی اسی طرح مؤدب بیٹھتا جس طرح ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا۔ بیٹا تقریر کرتا۔ اگر تقریر کھلی ہوئی کر دی اور مصنف کتاب کا مطلب صحیح طور سے ادا کر دیا تو فبہا۔ اور اگر ناپختگی اور نومشقی یا زیر درس مقام کے

عسیر الفہم اور دقیق ہونے کی وجہ سے معلم نوجوان اپنے متعلم بزرگ کو مطمئن نہ کر سکتا تو فوراً ڈانٹ پڑتی۔

"خود بھی سمجھا ہے یا یونہی تقریر جھاڑ رہا ہے"

اب بے چارہ معلم پھر سرگرم تقریر ہوا اور تفہیم کی ایک سعی کی۔ اس بار بھی اگر والد ماجد نے کوئی کمی محسوس فرمائی تو سہ بارہ لب کشا ہوا۔ غرض مولانا کو اپنے عہدِ تعلیم میں اس طرح تعلیم وتدریس کی مشق (۸) بھی کرائی گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ اس مشق نے میری تقریر میں یہ روانی، صفائی اور زور پیدا کیا ہے۔

اس شان سے تحصیل علوم کی تکمیل کرکے ۲۲ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ ہجری مطابق ۱۹۰۳ء میں مولانا نے سند فراغت اور روایت حدیث کی اجازت حاصل کی۔

حواشی:

(۱) میں نے بھی حساب کی تعلیم منشی جی سے حاصل کی تھی، منشی جی مولانا کی غیر معمولی ذہانت کے صدہا واقعات سنایا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ مولویوں کی ریاضی سے مناسبت یہ ایک ہی نظیر میرے سامنے ہے ورنہ حکیم برکات احمد ان کے استاد اور تمہارے دادا تو روپے کے پیسے بھی شمار نہیں

کر سکتے تھے، منشی جی کی ایک کتاب پر مولانا نے تقریظ بھی لکھی تھی۔ مولانا بعد میں ان کو ۲۵ روپے ماہوار پر دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے لیے اجمیر لے گئے تھے جبکہ انہیں مدرسہ ناصریہ میں ۴۰ روپے ماہانہ ملتے تھے۔

(۲) اس زمانے میں نصاب خسرو، خالق باری کریما، گلستان، بوستان، سکندر نامہ اخلاق جلالی وغیرہ نصاب میں تھیں۔

(۳) جن میں سے دو (مولوی نصیر احمد صاحب اور مفتی خلیل الرحمن صاحب جو) حکیم صاحب کے شاگرد ہی تھے۔

(۴) صرف حکمت ریاضیہ ہی ایک ایسی وادی تھی جس کی مولانا سید برکات احمد نے کبھی سیر نہیں فرمائی تھی۔ انہیں اس فن سے مناسبت بھی نہیں تھی۔ مولانا معین الدین نے اس کمی کو مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے حاصل کرکے پورا کیا اور پھر عمر بھر اس فن کی کتابوں کا درس اس شان سے دیتے رہے جس شان سے حکمت کے دوسرے انواع کا درس دیتے تھے۔

(۵) میر باقر داماد کی مشہور کتاب کا امام ہمام مولانا فضل حق خیر آبادی نے حاشیہ لکھا تھا۔ پورے برصغیر میں صرف چند مخطوطات ہیں۔

(۶) "مطالعہ" غالباً صرف خیر آبادی سلسلہ کی مخصوص اصطلاح ہے۔ استاد اور شاگرد دونوں کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ زیر تعلیم و متعلم کتاب بقدر درس پہلے سے مطالعہ کرلیں۔ اس کا اس قدر اہتمام والتزام کیا جاتا تھا کہ ابتدائی کتابوں تک کے درس سے پہلے مطالعہ کرلینا اساتذہ نے اپنے اوپر فرض کر رکھا تھا اور جس روز اس کا موقعہ نہیں ملتا صبح بے تکلف کہہ دیتے تھے کہ آج سبق

نہیں ہوگا۔ رات کو مطالعہ نہیں کرسکا۔ تلامذہ کو مطالعہ کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔ مثلاً اس کی نگرانی کی جاتی تھی کہ طلبہ صرف متن کتاب کا مطالعہ کرکے اخذ مطالب کریں حواشی پر نظر نہ جانے پائے۔ اگر طالب علم کے کسی سوال وغیرہ سے مطالعہ حواشی کی بو بھی آجاتی تو سخت تنبیہ کی جاتی اور درس گاہ میں اس کی "صف" تبدیل کردی جاتی تھی۔ جو ایک سخت اور شرمناک سزا تھی۔ علامہ عبدالحق کو نحو کی کافیہ لابن الحاجب کے درس کا ذوق تھا اس کی شرح (تسہیل الکافیہ) بھی لکھی تھی۔ مگر اس کا درس بھی مطالعہ کے بغیر نہیں دیتے تھے۔

(۷) ٹھیک اسی قسم کا واقعہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ حکیم صاحب نے حاشیہ شفا خوالنادری انھیں دیا تھا کہ کسی معتبر و مضمد آدمی سے اس کی نئی جلد بنوادیں۔ انہوں نے اپنے کتاب مارامار نقل کی بعد میں گرانقدر معاوضہ دے کر چند گھنٹوں میں اس کی جلد بنوا کر کتاب استاد مکرم کو واپس کردی۔ معارف ۲۵.

(۸) عہد تعلیم میں تعلیم کی اس مشق کا نام قدیم درسگاہوں میں "تکرار" تھا جماعت کا محنت وشوق وذہانت میں نمایاں طالب علم دوسرے طلبہ کو استاد کے سبق کے بعد دوبارہ سبق پڑھایا کرتا تھا۔ باقی طلبہ کو اس تکرار سے سبق یاد ہوجاتا اور اس عریف کو تدریس وتقریر کی مشق ہوجاتی۔ علامہ عبدالحق کے نبیرہ، گرامی مولانا حکیم ظفر الحق خیر آبادی مولانا کے ہم درس تھے۔ ان کے ساتھ تکرار کے وقت مولانا نے جو جملہ کہا تھا۔ ان کی ذہانت خود شناسی اور اس

عہد شباب میں پختہ کاری کا مظہر ہے۔ مولانا نے فرمایا: "میاں تم ننگ خاندان ہو کہ تمہارے خاندان میں تم جیسا کم سواد پیدا نہیں ہوا۔ میں فخر خاندان ہوں کہ میرے خاندان میں مجھ جیسا صاحب علم پیدا نہیں ہوا۔"

سندِ حدیث

مولانا نے سند حدیث حکیم صاحب سے حاصل کی تھی۔ حکیم صاحب نے تین اساتذہ سے حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قرأت وسماعت فرمائی تھی۔

۱..... مولانا شیخ محمد محدث تھانوی۔ یہ بزرگ شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے۔ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خواجہ تاش تھے۔ علوم حکمیہ میں امام فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ ایک زمانے میں ٹونک میں رہے تھے۔ اس زمانے میں حکیم صاحب نے ان کو شمائل ترمذی سنائی تھی۔

۲..... مولانا شاہ علی احمد محدث بہاری سے سنن ترمذی پڑھی۔

مولانا علی احمد بہاری، شاہ محمد اسحق محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ پنجاب و سرحد میں برسوں جماعت مجاہدین کے ساتھ تیغ بکف رہے۔ پھر ٹونک چلے آئے تھے اور رئیس وقت کے پرائیوٹ سکریٹری (میر منشی) ہوگئے تھے۔ حکیم صاحب کی اہلیہ محترمہ کے نانا بھی تھے۔

۳..... قاضی محمد ایوب پھلتی قاضی القضاۃ بھوپال۔ آپ حکیم صاحب کے خالو بھی تھے۔ سند حدیث مولانا عبدالقیوم محدث بڈھانوی ثم پھلتی سے حاصل کی تھی۔ محدث بڈھانوی شاہ اسحق صاحب کے داماد بھی تھے اور شاگرد بھی۔

گویا اس طرح مولانا کے اور شاہ صاحب کے درمیان دو واسطے بھی ہیں اور تین بھی۔

مولانا اور شاہ ولی اللہ کے درمیان چار واسطے بھی ہیں اور پانچ بھی۔ مولانا اور امام بخاری کے درمیان ۱۸ واسطے بھی ہیں اور ۱۹ بھی۔ مولانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان (اگر ثلاثیات بخاری کرلیا جائے) تو ۲۱ وسائط بھی ہیں اور ۲۲ بھی۔

مولانا کی مکمل سند حدیث حسب ذیل ہے۔

مولانا معین الدین، مولانا سید برکات احمد، قاضی محمد ایوب محدث پھلتی، ملا عبدالقیوم محدث بڈھانوی، شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ ابوطاہر مدنی، شیخ ابراہیم کردی، شیخ احمد قشاشی، الشمس محمد بن احمد الرملی، الزین زکریا الانصاری، حافظ ابن حجر العسقلانی، ابراہیم احمد التنوخی، المعروف بالبرہان الشامی، الشیخ احمد بن ابی طالب الحجار،

ابو عبداللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی، ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحٰق السنجری، الصوفی الہروی، جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمن بن محمد الداودی، ابو محمد عبداللہ محمد بن مظفر الفربری، ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری۔

مولانا نے فراغت کے ایک عرصہ کے بعد ۳۲ سال کی عمر میں (۱۳۴۱ھ میں) اپنے مرشدزادہ مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی سے بھی سند اجازت حاصل کی تھی۔ ہم ذیل میں وہ سند بھی نقل کرتے ہیں:

اجازنی جدی ومرشدی مولانا محمد عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ بما اجازہ مشائخہ قال حدثنا شیوخی وھم الشیخ العارف الکامل الملا محمد حسن بن بدر المدنی والشیخ حسین احمد والشیخ مرزا حسن علی وھما من تلامذ الشیخ الحافظ المحدث الشاہ عبدالعزیز الدہلوی عن الشعیب وابی الیاس الشامی وبدر المدینی عن الامام ابی عامر البصری عن الحسین المصری عن ابیہ جعفر

المصری عن الامام محض الحسینی عن عمابیہ موسی الرضا عن ابیہ کاظم عن ابیہ حسین عن ابیہ عبداللہ عن ابیہ موسی الکاظم عن ابیہ الامام جعفر الصادق عن ابیہ الامام محمد الباقر عن ابیہ الامام علی زین العابدین امام الساجدین عن ابیہ الامام سید اشہداء حسین بن علی وبن النبی عن ابیہ علی المرتضیٰ خلیفۃ رسول اللہ۔

سند معقولات

مولانا معین الدین کی سند معقولات شیخ الرئیس ابو علی بن عبداللہ بن حسین بن سینا (ف ۴۲۷ھ) پر منتہی ہوتی ہے۔ یہ بڑی نادر سند ہے۔ اس لیے یہاں مفصلاً درج کرتے ہیں۔

مولانا معین الدین اجمیری ف ۱۳۵۹ھ، مولانا سید برکات احمد ف ۱۳۴۷ھ، علامہ عبدالحق خیرآبادی ف ۱۳۱۶ھ، امام فضل حق خیرآبادی ف ۱۲۷۸ھ، مولانا فضل امام خیرآبادی ۱۲۴۴ھ، مولانا عبدالواجد

خیرآبادی ف ۱۲۱۸ھ ، ملا محمد اعلم سندیولی ۱۱۸۹ھ ، ملا
نظام الدین سہالوی ف ۱۱۶۱ھ ، ملا امان اللہ بنارسی
۱۱۳۳ھ ، ملا دانیال ، عبدالسلام دیوی ف ۱۰۴۷ھ ،
عبدالسلام لاہوری ف ۱۰۳۷ھ ، امیر فتح اللہ شیرازی
ف ۹۹۷ھ ، جمال الدین محمود شیرازی ف ۹۳۷ھ ،
جلال الدین دوانی ۹۰۸ھ ، مظہر الدین گاذرونی ، میر
سید شریف جرجانی ف ۸۱۶ھ ، قطب الدین رازی ف
۸۶۶ھ ، قطب الدین شیرازی ف ۷۱۰ھ ، نصیر الدین
طوسی ف ۶۷۳ھ ، فرید الدین داماد نیشاپوری ف
ھ ، افضل الدین خیلای ف ھ ، ابوالعباس
لوکری ف ھ ، بہمنیار ف ھ ، شیخ
الرئیس ف ۴۲۷ھ

شیخ الرئیس کے بعد ابونصر فارابی ف ۳۴۳ھ سے ہوتا ہوا یہ
سلسلہ ارسطاطالیس ۳۸۴ق م ، افلاطون ۳ق م ، سقراط ۴۰۰ق م ،
فیثا غورث ۵۰۸ق م ، طالیس ۶۲۰ق م تک پہنچتا ہے۔

مناظرہ دہلی

فراغ و تکمیل کے کچھ ہی دن بعد مولانا کو سفر دہلی کا اتفاق ہوا۔
دہلی میں ان دنوں شمس العلما مولوی عبدالحق حقانی دہلوی کے زیر
اہتمام آریوں سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ آریوں کی طرف سے پنڈت
داشانند تھے، مسلمانوں کی طرف سے کئی مناظر تھے اور بحث و گفتگو
طویل ہوتی جارہی تھی۔ تین روز ہو چکے تھے، مناظرہ کے منتظمین میں
مرزا محمد علی خاں بھی تھے، جو ایک عرصہ تک ٹونک کی اسٹیٹ کونسل
کے ممبر رہ چکے تھے اور اب وظیفہ یاب ہو کر دہلی میں مقیم اور رفاہی
وفلاحی کاموں میں عمر بسر کر رہے تھے، مذاہب باطلہ کی تردید و تغلیط سے
خاص دلچسپی رکھتے تھے، خود بھی آریوں کے رد میں ایک وزنی و مدلل
رسالہ "رقیمۃ الوداد" تالیف کر چکے تھے۔ تیسرے روز مولانا بھی
مجلس مناظرہ میں پہنچ گئے اور ایک گوشے میں بیٹھ کر طرفین کے سوال
وجواب سن رہے تھے۔ مسلمان علما کا زور بیان اور انداز استدلال
آریہ مناظر کے لیے مسکت ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ مسلمان حاضرین
جلسہ کے دل بجھے بجھے سے تھے اور مجلس کے منتظمین چپ چپ سے
تھے کہ اچانک انہی مرزا محمد علی خاں کی نظر ایک گوشے میں بیٹھے
ہوئے اس نوجوان عالم پر پڑگئی ان کے دل کی کلی کھل اٹھی، وہ اپنے
عہد قیام ٹونک میں اپنے دوست زادے کی ذکاوت و فطانت، جودت

وحدت ذہن، طاقت وطلاقت لسان کا مشاہدہ کر چکے تھے، وہ درسگاہ برکاتی کے طلبہ میں اس کے امتیاز سے واقف تھے۔ ان کے دل نے کہا کہ اس کشتی کو یہ پار لگائے گا اور اس کشتی کو یہ جیتے گا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا ان کے قریب پہنچے۔ غالباً سوچتے ہوں گے کہ دہلی آنے کا سبب پوچھیں گے، والد ماجد کی خیروعافیت دریافت کریں گے مگر مرزا صاحب نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مولانا کو ہاتھ پکڑ کر منبر پر بٹھادیا۔ کہ بیٹے، برسوں کی ذہنی ورزش کا آج امتحان ہے کوئی نیا داؤں مارو۔ مسلمانوں کی لاج آج تمہارے ہاتھ ہے۔

مولانا ۲۲ سال کے ناتجربہ کار اور نو عمر عالم سہی مگر آخر انھیں ایک دن علامۃ الہند بننا تھا۔ بڑے بڑے جغادریوں سے ٹکریں لینا تھیں، بہت سے معرکے سر کرنا تھے، بے تکلف کھڑے ہوگئے اور آغاز کلام کردیا۔

مگر آغاز کلام کیا: آغاز واختتام کے سارے مراحل صرف ۷ منٹ میں طے ہوگئے۔ انہی سات منٹ میں مولانا نے آریہ مناظر کے استدلال کی پوری عمارت ڈھادی اور اختصار وجامعیت کے ساتھ چند جملوں میں اس کے دلائل کا تاروپود بکھیر دیا اور بہت الذی کفر کا جان بخش ودل آویز نظارہ اہل جلسہ کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ شرکا،

(۱) کے نکھے نکھے سے دل باغ باغ ہوگئے۔ منتظمین کے چہروں پر مایوسانہ زردی کی جگہ وفود مسرت کی گلابیاں چھوٹنے لگیں۔

اصل میں قصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے چند ایسے علماء حمیت اسلام کے جوش میں مجلس مناظرہ میں داد حمایت اسلام دینا چاہتے تھے جو منقولات میں تو بے شک درک رکھتے تھے لیکن مباحثہ جس گروہ سے تھا اسے ان منقولات کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اگر منقول کو تسلیم کرلیتا تو پھر اختلاف ہی کیا رہ جاتا۔ لیکن مشکل تو یہی تھی کہ وہ اپنے مذہب کی تائید کرتا تھا تو عقلی دلائل سے اور اسلام کا رد کرتا تھا تو عقلی دلائل سے اور فلسفیانہ اصطلاحوں میں اپنے اعتراضات کے جوابات بھی اسی انداز پر اسی زبان اور انہی اصطلاحوں میں مانگتا تھا۔ اور ہمارے علماء میں کمی تھی تو اسی کی اور انہیں نہیں آتا تھا تو یہی فن۔ انھیں کلام وفلسفہ پڑھایا ہی نہیں گیا تھا ان کی نظر میں یہ فنون لاحاصل بھی تھے اور غیر نافع بھی، مردود بھی تھے اور مغضوب بھی۔ اسی لیے تین روز ہوگئے تھے، اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی مسلمانوں کی طرف سے بڑے بڑے مناظر (۲) ایک کج رائے، گم کردہ راہ، ضال ومضل کو چت نہیں کرسکے تھے۔ مگر ایک نو عمر وسبزہ آغاز غیر معروف وناتجربہ کار خیرآبادی البرکاتی عالم نے

سات منٹ میں ---- صرف سات منٹ میں خاموش ولاجواب مبہوت وساکت کرکے رکھ دیا۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اسے جہاں علوم نقلیہ میں بھی ان حضرات کی طرح مہارت حاصل تھی وہاں وہ فلاسفہ، روم ویونان کے مزعومات وخرافات اور ان کے ضعف وبطلان سے بھی خوب خوب واقف اور کلامیات پر عبور کی وجہ سے ان کے ابطال وتردید وتغلیط پر بھی قادر تھا اور اس نے عمر عزیز کا بہترین دور اپنی جسمانی وذہنی صلاحیتوں کا بڑا حصہ اس فن کو حاصل کرنے میں صرف کیا تھا۔

مذہب باطلہ کے علم بردار وں نے چند ایسے مقدمات اور قضایا کو جو بین بنفسہا اور بدیہی اولی ہیں بلکہ اصول موضوعہ اور مصادرات ہیں، "علوم متعارفہ" مان کر اور منوا کر انہی پر اپنے دعادی ودلائل کی بنا رکھی تھی، حال آنکہ نہ اصول موضوعہ اور مصادرات کو علوم متعارفہ اور مسلمات کہا جاسکتا ہے نہ ان پر بناء ادلہ صحیح ہے۔

آریہ مناظر کا دعویٰ تھا کہ

"جیو (روح) اور پرکرتی (مادہ) اناوی (قدیم) ہیں۔"

اور اپنے لغو اور غلط دعوے پر دلائل انہی نام نہاد "علوم متعارفہ" سے لاتا تھا۔ علوم متعارفہ ہوتے ہیں مقدمات بدیہیہ، جن کا

مسلم عند الفریقین المتخاصمین والمتناظرین ہونا ضروری ہے اور واقعہ یہ نہیں ہے۔

مثلاً آریہ مناظر قدم روح کے دعوے پر دلیل یہ لاتا تھا کہ

ذات باری (پرمیشور) قدیم ہے اور اس کی سب صفات، علم، قدرت، ارادہ وغیرہ بھی قدیم ہیں۔ اگر روحوں کو قدیم نہ مانا جائے تو ذات باری کی مثلاً صفت علم کو بھی قدیم نہیں کہا جاسکے گا۔ کیونکہ مسلمات میں سے ہے کہ تحقیق علم وجود معلوم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

اور معلوم کے وجود سے وجود خارجی مراد لیتا تھا۔ حال آنکہ در حقیقت تحقق علم کے لیے معلوم کا وجود خارجی ضروری نہیں ہے۔ تحقق علم کے لیے معلوم کا وجود مطلقاً کافی ہے۔ خواہ وجود ذہنی ہو خواہ خارجی۔ کیونکہ کسی موجود کے معدوم وفنا ہو جانے کے بعد کی صورت میں ہم سوال کرتے ہیں کہ اس کا علم باقی رہا یا زائل ہو گیا۔ اگر زائل ہو گیا تو اولاً تو جہل لازم آیا۔ ثانیاً حدوث صفات باری لازم آیا (وہما خلاف المفروض) اور اگر باقی رہا تو تحقق علم معلوم کے وجود خارجی کے بغیر ثابت ہو گیا۔ مثلاً ہم ایک مکان بنانا چاہتے ہیں، تو اس کے نقشے کا

تصور کرتے اور اس کی صورت ذہن میں لاتے ہیں ۔ گویا ہمیں اس مکان کی صورت کا علم ہوتا ہے ۔ حال آنکہ ابھی معلوم (مکان) کا وجود خارجی نہیں ہے ۔ لہٰذا علم معلوم کے وجود خارجی کے بغیر متحقق ہو گیا اور دلیل کی بنا ہی ڈھے گئی ۔

ایسے ایسے ہزاروں نکتے یہ نو عمر و غیر معروف متکلم الاسلام پیدا کر سکتا تھا ۔ مگر صرف ایک ہی نکتہ اور صرف (۳) منٹ میں حریف کو مبہوت و متحیر کر کے شکست فاش دی اور لاکھوں کا مجمع نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا ۔

حواشی

(۱) شرکاء جلسہ میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں جیسے اکابر ملت بھی تھے ۔ خواص علماء میں مولانا عبد السلام نیازی مقیم دہلی اس مناظرہ میں موجود تھے اور انھیں اس جلسہ کی مکمل روئداد اس وقت بھی یاد ہے ۔

(۲) یہ ملحوظ رہے کہ یہ ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے ۔ یاد کیجئے کہ ۱۹۰۳ء میں دہلی میں کون کون سے علماء موجود و حیات تھے اور ان کے اسمائے گرامی کے ماقبل و مابعد کیسے کیسے القاب و خطابات نہیں لکھے جاتے تھے ۔ مگر آپ نے دیکھا کہ جب نصرت و حمایت کا وقت آیا تو ان میں کوئی ایک بھی کام نہ آیا ۔

کاش اس فرقۂ زہاد سے اٹھتا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

(۳) یہ تو صرف ذات باری کی صفت علم پر گفتگو تھی، ابھی دوسری صفات قدرت و ارادہ وغیرہ اور پھر قدم مادہ کا ابطال باقی تھا اور پھر الزامی جوابات کی منزل تھی مگر "الذی کفر تو بہت کی نشاں" بن کر رہ گیا تھا اور ۳ ہی منٹ میں گفتگو ختم ہو گئی ۔

سفر لاہور

اسی سال مولانا لاہور تشریف لے گئے ۔ وہاں پہنچتے ہی مدرسہ نعمانیہ میں مسند صدارت کو زینت بخشی اور ڈھائی سال بڑی شان وشوکت سے داد تدریس دی ۔ معاصرین کے دلوں پر دھاک بٹھائی، طلبہ پر سکہ جمایا اور شب و روز محنت شاقہ کر کے ایک کامیاب مدرس (۱) کی حیثیت سے نام پیدا کیا اور درسگاہوں کی دنیا میں وہ مقام پیدا کیا جو پھر ان سے چھینا نہ جا سکا ۔ مولانا محمد حسین "درۃ التاج" میں لکھتے ہیں: ۔

"ایک سال کے اندر کل صوبہ پنجاب میں حضرت مولانا کے درس کا چرچا پھیل گیا اور ہر طرف سے جوق جوق طلبہ آنے لگے ۔ منتظمین دار العلوم (نعمانیہ) نے قدردانی کی عملی مثال یہ قائم کی کہ طلبا

کی مقررہ تعداد میں دو چند اضافہ کر دیا لیکن جب طلبہ کی کثرت اس اضافہ کی حد سے بھی گزر گئی اور مجبوراً اہل خیر اور ارباب کرم کی طرف رجوع کیا گیا، جنھوں نے نہایت فراخدلی اور بلند حوصلگی کے ساتھ مہمانان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کو اپنے ذمہ لے لیا۔

(درۃ التاج - ۳)

حاشیہ:

(۱) تدریس کے علاوہ مولانا لاہور میں مطب بھی کرتے تھے۔ ٹونک میں کتب طبیہ پڑھی بھی تھیں اور پڑھائی بھی تھیں۔ ان کے برادر خورد تو طب سے خصوصی مناسبت رکھتے تھے۔

اجمیر میں

مولانا بڑے جوش و انہماک، شوق و ولولہ اور ذوق و محنت کے ساتھ مدرسہ نعمانیہ میں مصروف تدریس تھے کہ ٹونک سے انھیں والد ماجد کی ہدایت موصول ہوئی کہ اجمیر منتقل ہو جائیں۔ مولوی عبدالرحمن صاحب نے ریاست کے تنگ دائرہ جدو جہد، سازشی ماحول اور صرف ایک فرد (رئیس) کے چشم و ابرو کی حرکت سے آنے والے انقلابات کے پیش نظر اپنے صاحبزادوں کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ

مستقل سکونت اور نئی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے اجمیر کا انتخاب کریں۔ چنانچہ ان کے اس فیصلہ کے پیش نظر مولانا کے برادر خورد مولوی حکیم نظام الدین (اب شفاء الملک مولوی حکیم حاجی نظام الدین) اجمیر منتقل ہو کر آغاز مطب کر چکے تھے۔ چنانچہ مولانا بھی تعمیل حکم میں ڈھائی سال قیام کے بعد (ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ، م ۶-۱۹۰۵ء میں) لاہور سے اجمیر منتقل ہو گئے۔

مدرسہ معین الحق

لاہور میں مولانا نے جس شفقت و محنت سے طلبہ کو پڑھایا تھا اس کی وجہ سے طلبہ کا ایک وسیع حلقہ ان کا گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا اور اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ لاہور سے یکہ و تنہا روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ جب اجمیر کے لیے عازم ہوئے تو طلبہ کی ایک کثیر جماعت ان کے ساتھ اجمیر پہنچی اور یہاں بھی سلسلہ درس کا آغاز ہو گیا طلبہ کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا اور روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ "معین الحق" نام سے ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں ایک مدرسہ کا اجرا فرمایا۔

نظام دکن کی سماعت درس

مدرسہ معین الحق جاری تھا، اخراجات مدرسہ اجمیر کے نادار

عوام کے ذمہ تھے، نہ کسی رئیس کی امانت حاصل تھی، نہ کسی حکومت
کی سرپرستی - مدرسہ کے بانی اور صدر مدرس مولانا تھے، مگر ان کا
مشاہرہ کل ۵۰ روپے ماہوار تھا - اس سے مدرسہ کے کل مصارف اور
بجٹ کا تخمینہ لگایا جاسکتا ہے - مگر اس "کم" پر اگر "آپ کیف" کو قیاس
کریں گے تو سخت غلطی کریں گے اور کل کی حالت کا اندازہ اگر آج کی
حالت سے کرنا چاہیں گے تو دھوکہ کھائیں گے - کیونکہ اس مدرسہ کی
آمدنی اور کمیت کم سے کم ہونے کے باوجود کارکردگی اور کیفیت زیادہ سے
زیادہ تھی - آج کی درسگاہوں کی سی وسیع وکشادہ حسین وخوشنما
عمارات کے سلسلے کے بجائے مختصر سی معمولی سی، کرایہ کی عمارت
تھی - نفیس وسبک اور بیش قیمت فرنیچر کے بجائے ٹاٹ یا چٹائی کا
فرش اور معمولی سادہ لکڑی کی بھدی تپائیاں تھیں - آج کے
مدرسین کی سی گراں قدر معاوضوں کے باوجود "حقوق طلبی" کے
بجائے وہاں کے مدرسین کو پڑھانے بلکہ پڑھائے چلے جانے، سکھائے
اور سب کچھ سکھا دینے کا شوق اور ولولہ تھا - اوقات درس کی پابندی
کے بجائے اصل درس کی پابندی تھی - کتاب پڑھانے کے بجائے فن
سکھانا مقصود تھا - مدرسین کی برتری اور فوقیت کا معیار گریڈ اور
الاؤنس نہیں تھا بلکہ فوقیت اس مدرس کو حاصل تھی جو روزانہ زیادہ

سے زیادہ اسباق پڑھاتا تھا - جو طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرسکتا تھا
جس کو سند سے نہیں مقصد سے عشق تھا - غرض یہ کہ علمی اور سراسر
علمی ماحول تھا - طلبہ کا مقصد حصول سند نہیں، حصول علم ہوتا تھا اور
مدرسین کا شعار بھی علم تھا اور دثار بھی علم تھا اور اس محفل کی روح
ورواں تھے مولانا معین الدین -

ایک دن یہی مرد میدان علم وفن اس سادہ وحقیر عمارت میں
چٹائی کے ایک فرش پر علوم دین کے طلبہ کی ایک جماعت کو باہزاراں
وقار وتمکنت اور بغایت انہماک ومحویت سنن ابی داؤد، کا درس دے
رہا تھا کہ نظام دکن آگیا -

نظام دکن --- آپ پہچانے --- "یہ آج کا" شری عثمان علی
خاں" نہیں، جو نئی دہلی کہ نہروؤں، پٹیلوں، شاستریوں اور اندراؤں
کا تابع فرمان اور بے زور وبے اثر اور اقتدار وحکومت سے محروم ہے،
بلکہ کل کا آصف جاہ سابع سلطان دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ فرخندہ بنیاد
ریاست حیدرآباد کا بلاشرکت غیرے والی وحکمران، عالم اسلام کا وہ
کون سا گوشہ تھا جو اس کی زرپاشیوں سے محروم ہوا اور برصغیر کا وہ کون
سا مسلم ادارہ تھا جو اس کی سرپرستی واعانت سے متمتع یا اس کا
امیدوار ومتمنی نہ ہو - صدہا علما اس کے وظیفہ خوار تھے، اور ہزارہا

علماء وظیفہ کے لیے خواہاں وکوشاں۔

ہاں تو یہی نظام دکن اجمیر آیا ہوا ہے، صدہا علماء، شعراء، زہاد، شیوخ، ملاقات ----- صرف ایک نیاز مندانہ سلام کی آرزو لیے ہوئے اس کی قیام گاہ کا چکر کاٹ رہے ہیں۔ مدارس، خانقاہوں، یتیم خانوں، کالجوں اور دوسرے اداروں کے منتظمین اپنے اپنے اداروں کا معائنہ کروانے اور وقتی یا مستقل امداد واعانت کے لیے مصروف جدوجہد ہیں۔ مگر معین الحق ان سب سے الگ ادارہ ہے۔ اس کا بانی وسربراہ بھی تو اپنے مزاج، دل ودماغ اور فطرت کے اعتبار سے نرالا اور انوکھا ہے، اسے نہ یہ خبر کہ شہر میں کون آیا ہوا ہے نہ اسے اس کی ضرورت کہ اس مؤقر وزر پاش وارد شہر کے سامنے دوتا ہو کہ ایک عدد سلام رسید کرے۔ وہ ایک عالم دین ہے، اور علم دین کے مقام ومنزلت سے واقف ہے۔ خود اس کے دل میں علم دین کی عزت ہے، اور وہ علم دین اور حاملان علم دین کی عزت کروانا خوب جانتا ہے۔ وہ ایک "فقیر" ہے اور فقر کا مرتبت شناس بھی۔ اسے امراء کے دروازوں پر حاضری کا شوق ہے نہ سلیقہ، اسے سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے کا فن آتا ہے قصیدہ گوئی کا نہیں۔ وہ رئیس کے سامنے پاؤں پھیلا کر بیٹھنے والوں میں سے ہے ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہونے والوں میں سے

نہیں ---- بہر حال:۔

خود تو نہیں دیکھا مگر متعدد دیکھنے والوں سے خود سنا ہے اور ثقہ ومتدین بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک دن فقر وشاہی کا تصادم ہوا تھا۔ دولت اور علم کی جنگ ہوئی تھی۔ امیر اور فقیر کا مقابلہ ہوا تھا اور اس معرکہ میں شکوہ امیر پر جلال فقیر کو غلبہ رہا تھا۔ ایک مدرسہ کی چار دیواری کے سامنے ایک بلند وبالا ایوان حکومت جھک گیا تھا۔ دولت نے علم کو سلامی دی اور ایک فرماں روا نے ایک مدرس کے یہاں حاضری دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ:۔

ایک دن مولانا معین الدین درس حدیث دے رہے تھے، درسگاہ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سامعہ نواز صداؤں سے گونج رہی تھی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار واحادیث معرض قرآت وسماعت میں تھے ابو داؤد الطیالسی کی "سنن" سامنے دھری تھی اور مولانا کی گل افشانی گفتار دیدنی تھی اور شنیدنی بھی۔ محمد عربی کا ذکر جمیل اور معین الدین جیسا عاشق رسول۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

تقریر جاری تھی، زیر درس حدیث کا حسن وصحت معرض تحقیق میں تھا کہ نظام آگیا وہی آصف جاہ سابع اعلیٰ حضرت حضور نظام

فرمانروائے دکن و برار، خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، مولانا انوار اللہ ساتھ
ساتھ تھے اور خدم و حشم پیچھے پیچھے، مدرسہ میں داخل ہوا، سامنے ہی
مولانا کا دربار درس آراستہ تھا، آگے بڑھا درسگاہ میں داخل ہوا کھڑا رہا
پھر خود ہی بیٹھ گیا مگر درس جاری رہا۔

سن رہے ہیں آپ! درس جاری رہا۔ مولانا اسی شان انہماک
کے ساتھ سرگرم تقریر رہے، نہ استقبال، نہ تعظیم، نہ خوشامد نہ خوش
آمدید!

دماغ کبر گدایان رہ نشیناں بیں
کہ در نگاہ نیا رند کجلا ہاں را

درسگاہ اسی طرح "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے
نغمات سے گونجتی رہی۔ نظام دکن چٹائی پر مؤدب بیٹھا ہوا تھا اور بڑی
دلچسپی اور توجہ سے تقریر درس سن رہا تھا۔ مگر درویش مزاج، فقیر طینت
اور فنافی العلم مدرس کو مطلق خبر بھی نہیں تھی کہ "حضور نظام" بھی
اس کی لذت تقریر کا اسیر ہو رہا ہے تقریر اپنے وقت پر ختم ہوئی تو
فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں متعارف ہوئے۔

"اہلاً و سہلاً ـــ فضیلت جنگ کو نہیں مولانا انوار اللہ خاں کو۔
حضور نظام تشریف فرما ہیں" مولانا انوار اللہ نے فرمایا۔

"خوب ـــ" مولانا معین الدین نے مختصراً بے نیازانہ جواب
دیا۔

"آپ کی تفہیم خوب ہے" خود نظام دکن نے مولانا سے عرض کی۔

"آپ کی سمجھ میں آ رہی تھی؟" مولانا نے وہی بے نیازانہ
وفقیرانہ انداز میں مدرسانہ سوال کیا۔

"جی، جی بہت اچھی طرح" نظام دکن نے جواباً کہا۔

اور مدرسہ کی ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہوار اعانت کا اعلان
کر کے رخصت ہوا دیکھا آپ نے روزانہ صدہا مشائخ طریقت، ارباب
درس وافتا اور اصحاب جبہ و دستار میں سے صرف چند کو نظام کی بارگاہ
میں بار ملتا تھا اور وہ بھی بقدر یک سلام تعظیمی۔ اداروں کے معائنے
کی بیسیوں درخواستوں میں سے دو چار درخواستیں منظور ہوتی تھیں مگر
ان کا معائنہ بھی سرسری اور رواروی میں ہوتا تھا۔ معین الدین کے
معین الحق نے تو خواہش کی نہ کوشش، مگر نظام خود آگیا۔ اور جب آیا
بھی تو معاملہ رکھائی بے نیازی، بے توجہی اور تمکنت کا کیا گیا۔ مگر اس
کے باوجود سب سے زیادہ دیر تک اس فقیر اور حقیر شخص اور ادارہ کے
درس میں رہا۔ یہی صورت اعانت کی رہی۔ جو ہاتھ تغییر (۱) منکر کے

لیے بنائے گئے تھے وہ طلب و سوال کے لیے غیر خدا کے سامنے کبھی دراز ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ مگر جلال فقر و وقار علم سے مسحور مرعوب نظام نے خود پیش کش کر کے خدمت و اعانت کی سعادت حاصل کی۔

میں نے بکثرت ثقہ اصحاب سے اجمیر میں سنا ہے اور خود مولانا کی ایک یادداشت بھی میرے سامنے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی شان استغنا و فور علم، طلاقت لسان، انداز تقریر اور طریق تفہیم سے کچھ اس قدر متاثر بلکہ مسحور ہو کر اٹھا کہ دوسرے روز (۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ، م ۱۹۱۳ء) پھر بغیر اطلاع درس گاہ میں چلا آیا اور غدیر خم، بیعت رضواں، شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تاریخیں دریافت کیں۔ مدرسہ کے کتب خانے سے کتابیں منگا کر ان کا جواب دیا گیا۔

تیسرے روز (۱۹ ذی الحجہ) کو اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار کے درس سے لذت اندوز ہوا۔

چوتھے روز (۲۰ ذی الحجہ) کو پھر آیا اور اصول حدیث کی کتاب کے درس میں شرکت کی۔

پانچویں دن (۲۱ ذی الحجہ) کو پھر آیا اور تفسیر بیضاوی کا سبق دیتے ہوئے سنا۔ اور اس خیر آبادی البرکاتی فاضل معقولات کو

منقولات میں داد تحقیق دیتے اور حق تدریس ادا کرتے دیکھا۔

مولانا کے تلمیذ سعید و رشید مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے تحریر فرمایا کہ نظام دکن نے مولانا کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ اور خلعت (۲) بھی پیش کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ (۳) وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوار اللہ خاں کی تحریک پر مدرسہ، معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ اس کے لیے جاری فرمایا۔ مولانا اس کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک درس دیا۔ (۴)"

حواشی:

(۱) من رانی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ (الحدیث)

(۲) مبلغ ایک ہزار روپیہ مدرسین وطلبائے مدرسہ کو بطور انعام مرحمت

فرمایا۔ جس میں سے مبلغ ایک سو پچیس روپے بطور خلعت واختصاص جناب مولانا معین الدین صاحب کو خاص فرمایا گیا (روداد مبینہ عثمانیہ صفحہ ۶۔ ۱۳۳۱ھ

(۳) چھ نہیں۔ پانچ دن۔

(۴) باغی ہندوستان (مدینہ پریس بجنور، ۱۹۴۷ء) ف ۳۸۲، معارف اپریل ۴۰ء۔

مناظرہ مال پورہ

اسی سال رجب ۱۳۳۱ھ، م ۱۹۱۳ء میں مولانا نے ایک اور معرکہ سر کیا۔

ائمہ کی تقلید اور عدم تقلید کے علمی اختلافات ہمارے عہدِ غلامی میں مناقشات کے درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ آزاد اقوام حقیقی مسائل میں ہمہ وقت مصروف و گرفتار ہوتی ہیں۔ لیکن جب ان کے سر سے حکمرانی اور کار فرمائی کی ذمہ داری چھن جاتی ہے تو انھیں جو ذہنی فراغت و بے کاری لاحق ہوتی ہے اس کے نتیجے میں وہ نت نئے قومی، مذہبی، سیاسی مسائل پیدا کرتے اور ان میں باہم مناقشات و مجادلات سے اپنے اوقات کو صرف کرتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے دو سو سالہ عہد محکومی و زوال میں جب اقوام و ملل ہند پر اقتدار اور ان کی

امانت و سیادت سے فراغ و فرصت ملی تو خود انھیں بھی اس کی فکر ہوئی کہ وہ ائمہ فقہ میں سے کسی کی تقلید کریں یا نہ کریں اور کریں تو کس کی اور اس مسئلہ پر بھی جب اختلاف نے حسب دستور مخالفت کی شکل اختیار کرلی اور نوبت مناظرہ، مباحثہ بلکہ بعض اوقات و مقامات پر تو جنگ و جدال تک پہنچی۔

اس قسم کی آویزش ایک زمانے میں مالپورہ میں بھی پیدا ہو گئی تھی، جو ٹونک کے قریب ایک تاریخی قصبہ ہے، جس کی آبادی اکثریت سنی المسلک حنفی المذہب مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس آویزش کی تفصیل سید حامد علی صاحب نقوی کی زبانی سنیئے:

"ایک زمانے میں غیر مقلدوں کا بڑا زبردست پروپیگنڈا ہوا تھا۔ رجب ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں مولوی عبدالحکیم مرحوم نصیر آبادی (ایک سلفی المسلک عالم) یہاں آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا ایک ذخیرہ لائے اور احناف کو چیلنج دیا کہ اپنے علما کو مناظرہ کے لیے بلواؤ یا سب ترکِ تقلید کرو۔ حنفیوں نے ملا نذر علی مرحوم کو مولانا حکیم برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ٹونک بھیجا۔ حکیم صاحب تو اب

ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک کے مصاحب خاص تھے وہ
خود تو تشریف نہیں لا سکے لیکن انہوں نے اپنے شاگرد
رشید مولانا معین الدین اجمیری مرحوم جو اس زمانے
میں لندوت عالم اور راجپوتانہ کے لیڈر تھے ، اجمیر خط
لکھ دیا ---- اور مالپورہ جانے کے لیے ارشاد فرمایا۔

ادھر ٹونک سے مولانا مناظر احسن گیلانی (جو اس وقت معلم
تھے) مولانا عبدالرحمن شاقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ پہنچے ۔ اور ادھر سے
مولانا نے رخصت سفر باندھا ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے جاتے ہی
جلسے کو تقلید ائمہ کی ضرورت واہمیت پر ایک پرجوش ومدلل تقریر
فرمائی اور پھر مناظرے کے شرائط پر گفتگو شروع ہوئی ۔ اہل حدیث کی
طرف سے مولوی عبدالحکیم نصیر آبادی اور ان کے اعوان وانصار کی
طرف سے نت نئی اور ناقابل قبول شرائط پیش کی جاتی تھیں اس لیے
ان پر رد وقدح ہو رہی تھی ، گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا کہ اجمیر سے
مولانا معین الدین اجمیری پہنچ گئے ۔ ادھر تو مولوی عبدالحکیم کے لیے
مولانا کی آمد ایک غیر متوقع اور وحشت ناک حادثہ تھی ادھر مولانا نے
شرائط مناظرہ پر گفت وشنید کے اس لا متناہی سلسلے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا
کہ

"آپ کی ہر شرط ہمیں جوں کی توں منظور ہے
اور ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں ۔ بس اب مناظرہ
کا وقت مقرر کیجئے ۔"

مولوی عبدالحکیم اجمیر سے متصل ایک فوجی چھاؤنی نصیر آباد
کے رہنے والے تھے ۔ مولانا معین الدین کی بے پناہی سے واقف تھے ،
چہرہ بشرہ دیکھ کر کچھ ایسے بوکھلائے اور ست پٹائے کہ دوسرے دن صبح
جواب کا وعدہ کر کے رات ہی کو اچانک اور خاموشی کے ساتھ مالپورہ
سے روانہ ہو گئے ۔ صبح مالپورہ کے سادات احناف اور ٹونک واجمیر
سے آئے ہوئے علماء کو جب مولوی صاحب کے اس طرح یکایک بلا
اطلاع چلے جانے کا علم ہوا تو انہوں نے بجا طور پر اسے مولوی صاحب
کے عملی اعتراف شکست پر محمول کیا اور ادھر وہاں کے سلفی المسلک
مسلمانوں نے اپنے وکیل وترجمان کے یوں پشت دکھا جانے سے اپنی
ہیٹی سبکی محسوس کی اور ایک عرصہ تک یہ حضرات ندامت کی وجہ
اپنی سرگرمیوں سے باز رہے ۔ اس کے بعد بھی جب کبھی ان حضرات
کی طرف سے کوئی جارحانہ تحریک ہوئی احناف فوراً دھمکاتے ۔ "بلائیں
مولانا معین الدین کو" اور پھر کچھ روز کے لیے انہیں امن مل جاتا۔

۱۹۱۵ء میں مولانا کے پاس ایک استفتا آیا کہ جمعہ کی نماز کے لیے اذان ثانی فقہ حنفی کی رو سے کہاں ہونی چاہیے؛ امام کے سامنے، داخل مسجد، قریب منبر جیسا کہ بلاد اسلامیہ تعامل قدیم ہے؛ یا باب مسجد پر؛ بعض علما مسجد کے اندر منبر کے سامنے کھڑے ہو کر اذان دینے کو بدعت سئیہ کہتے ہیں اور ابو داؤد کی ایک حدیث سند میں لاتے ہیں جس کے ایک راوی صاحب مغازی ابن اسحاق ہیں اور فقہ کا یہ جزیہ بھی سند اپیش کرتے ہیں کہ یکرہ الاذان فی المسجد (مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے)۔

بعض علما سے ان کا اشارہ مولانا احمد رضا خان بریلوی اعلیٰ حضرت کی طرف تھا جنہوں نے سب سے پہلے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے باہر ہونی چاہیے (حق نما فیصلہ) اور اس کے بعد رسائل وفتاوی کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جواب اور جواب الجواب شائع کئے جا رہے تھے اور عوام مسلمین متحیر تھے (وقایۃ السنۃ) اس لیے مولانا معین الدین نے اس استفتا کے جواب میں جو مفصل فتویٰ تحریر کیا اور جو "القول الاظہر فی مایتعلق بالاذان عند المنبر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ (مطبع نظامیہ حیدر

آباد دکن ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) بحکم فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں استاد سلطان) اس میں فاضل بریلوی کے اقوال سے خصوصی اعتنا کیا تھا، کسی دوسرے عالم کی کسی تحریر سے اعتنا نہیں کیا تھا اور ۱۵ فصول میں مفصل کلام کر کے بلاد اسلامیہ کے تعامل، صدر اول سے اب تک کے اجماع اور احناف سے مسلک کی تحقیق و تصویب کی ہے۔

حدیث مذکورہ ابو داؤد پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ پہلی بات یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، لیکن اگر صحیح بھی ہو تو خبر واحد ہے جو ظنی ہے اس لئے اجماع قطعی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، پھر یہ حدیث محمد بن اسحاق نے سائب بن زید سے روایت کی ہے مگر انہی سائب بن زید سے بطریق دیگر جو حدیث مروی ہے اس میں علی باب المسجد کے بجائے علی المسجد آیا ہے اور صحیحین میں انہی سائب سے جو حدیث مروی ہے اس میں علی یدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم آیا ہے۔ لہذا محمد بن اسحاق اس زیادتی (علی باب المسجد) میں منفرد ہوئے اب یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ ثقہ حجت ہیں یا نہیں، ابن اسحاق کو ائمہ جرح وتعدیل میں سے کسی نے دجال کسی نے کذاب کسی نے قدری و معتزلی کسی نے شیعی، مدلس، منکر الحدیث ناقابل احتجاج، ضعیف الحفظ کہا ہے ہم انہیں دجال اور کذاب نہ بھی کہیں تو صاحب میزان الاعتدال کا یہ

فیصلہ تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ ماتفرد بہ فقیہ نکارۃ فان فی حفظہ شیئا اور اس فیصلے کی رو سے یہ روایت ضعیف ٹھہری اور قابل احتجاج نہیں رہی - اسی لیے علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جو فرمایا ہے علما کا عمل اس پر ہے کہ انہ لیس بحجۃ فی الحلال والحرام"

یکرہ الاذان فی المسجد کے جزیئے کا جواب یہ دیا کہ یہ حکم عام نمازوں کے لیے ہے، جمعہ کی اذان ثانی اس سے مستثنیٰ ہے، نماز جمعہ کے لیے صدر اول سے یہ تعامل رہا ہے کہ اذان ثانی عند المنبر ہوتی ہے جس کے لیے "قریبا من المنبر" اور "بین یدی الامام" بلکہ کالاقامۃ، تک کی صراحت ہے جس کا مقصد اذان اول کی طرح اعلام غائبین نہیں - اعلام حاضرین ہوتا ہے کہ ساکت و متوجہ ہو جائیں اس لیے اذان ثانی دو خاص حکم رکھتی ہے - بین یدی الامام اسے مستقبل الامام (امام کے رو برو، عین محاذات میں) ہو دوسرے داخل مسجد اور قریب منبر ہو، مراقی الفلاح میں ہے - والاذان بین یدیہ کالاقامۃ جری بہ التوارث۔

صوبہ بہار (ہند) ہر دور میں اعاظم علم و حکمت پیدا کرتا ہے - بیسویں صدی کے آغاز میں بھی وہاں مولانا سید برکات احمد کے ایک معاصر مولانا عبدالوہاب بہاری معقولات میں اپنی عظمت مقام اور کمال فن کا علم لہراتے ہوئے تھے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (ف ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) جیسے عظیم و کبیر مصنف و مدرس کے شاگرد تھے، برطانوی ہند سے شمس العلماء کا خطاب بھی مل چکا تھا، مدرسہ عالیہ (کلکتہ) کے مدرس رہ چکے تھے - کئی کتابوں کے مصنف تھے -

تو انھی شمس العلما مولانا عبدالوہاب بہاری اور مولانا سید برکات احمد میں ایک بار مجلس مناظرہ گرم ہو گئی تھی -

اس مناظرے میں مولانا معین الدین نے بھی حصہ لیا تھا - بس اسی مناسبت سے یہاں اس مناظرے کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، ورنہ کسی فریق کی حمایت کر کے ایک پرانے قضیے کو تازہ کرنا خدا شاہد کہ ہمیں مقصود نہیں ہے -

شمس العلما مولانا عبدالوہاب بہاری نے صحیفۂ ملکوتیہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا اور چاہتے تھے کہ نواب حامد علی خاں والئ رام پور اس کی طباعت کا اہتمام کریں، اس مقصد کے لیے وہ

رام پور تشریف لے گئے تھے۔ رسالہ میں علامہ عبدالحق خیرآبادی (ف ۱۸۹۸ء) پر جا بجا ایرادت لے گئے تھے۔ اس لیے نواب نے اپنے ایک عزیز اور فاضل وقت مولوی محمد علی عرف صاحب چھٹن صاحب جو علامہ عبدالحق سے تلمذ اور عشق کی نسبت رکھتے تھے یہ کیسے گوارا کرسکتے تھے کہ ان کی ریاست کے صرف سے ایک ایسی کتاب شائع کی جائے جس میں علامہ خیرآبادی پر ایرادات کیے گئے ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایرادات کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ تجویز مولانا بہاری کے سامنے رکھی کہ آپ مولانا سید برکات احمد سے مناظرہ کرلیں اگر آپ کے اعتراضات صحیح ثابت ہوئے تو یقیناً یہ کتاب ریاست کی طرف سے شائع کی جائے گی۔ مولانا بہاری نے یہ تجویز منظور کرلی، اب نواب حامد علی خاں نے والیٔ ٹونک نواب ابراہیم علی خاں کے توسط سے مولانا سید برکات احمد کو قدوم رام پور کی دعوت دی، ساتھ ہی صاحبزادہ چھٹن صاحب نے بھی حکیم صاحب کو براہ راست مدعو اور مجبور کیا، مولانا سید برکات احمد تقریر درس کے شہوار تھے، قرطاس وقلم کے میر مجلس تھے مگر مناظرہ کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔

ماقصہ سکندر ودارا نخواندہ ایم

پر دعوت دی تھی صاحب زادہ چھٹن صاحب نے جو دیوان عشق

میں ان کے ہم سبق رہتے تھے بلایا گیا تھا رام پور، جہاں انہوں نے برسوں طلب علم کے مراحل طے کیے تھے اور علامہ خیرآباد کے خم خانہ علم وحکمت سے دریانوشیاں کی تھیں پھر غیرت علمی کا سوال تھا۔ ان کے استاد محبوب اور مخدوم (علامہ خیرآباد) کے کلام پر بے جا اور بے اصل اعتراضات کیے گئے تھے اس لیے اس دعوت پر انہیں لبیک کہنا پڑا اور

من وگرز ومیدان وافراسیاب

کہتے ہوئے عزم رام پور فرمالیا، آپ کے اس عزم سفر کا اعلان ہونا تھا کہ اجمیر، پٹنہ، دربھنگہ، الہ آباد، بنارس، سہارن پور کے بہت سے برکاتیوں نے بھی رام پور کا رخ کیا اور اس طرح رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں چند دن کے لیے مناطقہ ہند کا مرکز ثقل منتقل ہوگیا۔

بالآخر خاص باغ میں ۱۱ جون ۱۹۱۶ء (۱۵ رمضان ۱۳۳۴ھ) کو والیٔ رام پور کی صدارت میں بزم مناظرہ برپا ہوئی -------- اور ختم ہو گئی۔

یہ مجلس، برعظیم کی درس گاہی دنیا کے لیے خصوصی دلچسپی کی محفل تھی، بیش تر مدارس سے اس کی مفصل وصحیح روداد کی اشاعت

کے مسلسل مطالبے کے پیش نظر ریاست کے سرکاری اخبار دبدبہ سکندری نے اپنی ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں اس ناظرے کی مفصل و صحیح روداد شائع کردی، جس میں واضح الفاظ و عبارت میں فتح کا انتساب مولانا سید برکات احمد سے کیا گیا تھا۔

اس خبر کی اشاعت سے مولانا بہاری کے اندر سویا ہوا بشر جاگ اٹھا اور انہوں نے اپنی شکست کی اس تشہیر سے اپنی سبکی محسوس کی اور بر بناء بشریت روداد مجلس، نتیجہ گفتگو اور صدر محفل و حاضرین کے تاثرات کو ایک رسالے (موسومہ مناظرہ رام مطبوعہ سراجی پریس کلکتہ) میں برعکس اور خلاف واقعہ تحریر کرکے فتح کا انتساب اپنی طرف کرنے کی سعی کی تھی، اس کے جواب میں برکاتیوں نے اپنے اپنے مراکز و مقامات سے حقیقت حال کی وضاحت کے لیے رسائل کی اشاعت کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا۔

ذیل میں ان میں سے چند رسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ ازالہ اوہام العاوی عن کلام الفاضل الخیرآبادی، از مولوی عبدالعزیز صاحب بہاری شاگرد مولانا مقبول احمد خاں صاحب در بھنگوی، مدرس مدرسہ۔ شمس الہدی بانکی پور پٹنہ مطبوعہ اخلاقی پریس پٹنہ۔

۲۔ چہار تازیانہ قہار مولفہ مولانا معین الدین اجمیری، صدر مدرس مدرسہ، معینیہ عثمانیہ اجمیر، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دھلی

۳۔ حقیقت مناظرہ رام پور مولفہ مولانا محمد شریف اعظم گڈھی صدر مدرس مدرسہ مظہر العلوم بنارس، مطبوعہ اکسیر اعظم پریس بنارس۔

۴۔ مناظرہ، مورو سلیمان مولوی محی الدین غازی اجمیری، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دھلی

۵۔ التقریر الکامل فی تنبیہ الغافل مولفہ مولانا محمد شریف اعظم گڈھی

۶۔ مانع غلط فہمی، مولفہ مولانا عبدالعزیز بہاری مدرس مدرسہ، شمس الہدی پٹنہ مطبع مجیبی پھلواری۔

۷۔ الاعلان مولفہ مولانا محمد شریف اعظم گڈھی

۸۔ الرماح الخطیہ علی الصحیفۃ المنکوسۃ، مولانا محمد شریف اعظم گڈھی (اکسیر اعظم پریس بنارس)

۹۔ عجائب الدہور، مولفہ مولانا عبدالعزیز (اخلاقی پریس بانکی پور)

۱۰۔ الطامۃ الکبری، مولانا مقبول احمد خاں در بھنگوی مدظلہ (مطبع مجیبی پھلواری)

۱۱۔ کھلی چھٹی کا کھلا جواب، مولانا معین الدین اجمیری (دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

ان رسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا اور میدان کارزار گرم تھا کہ اچانک خبر آئی۔

"مولانا عبدالوہاب بہاری اللہ کو پیارے ہوگئے"

خبر سن کر مولانا سید برکات احمد نے اپنے تمام تلامذہ کو رقعے روانہ کیے:

"سلسلہ بند کر دو"

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

یہ مناظرہ علماء عقلیات کے درمیان غالباً تاریخ کا آخری قابل ذکر مناظرہ تھا اس کے بعد تو بساط ہی الٹ دی گئی۔ اب عقلیات ہی کی قدر باقی رہی نہ علماء عقلیات کی، قدریں ہی بدل گئیں، وہ موضوعات رہے نہ وہ مسائل، ان کے سمجھنے والے ہی اٹھ گئے، ان میں الجھنے والے دکان بڑھا گئے، وہ نظریات وہ مسائل، وہ شخصیات سب اس دور کے لیے اجنبی ہو کر رہ گئے، یہ دور ہی اور ہے۔

تو اس مناظرے میں مولانا معین الدین نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا اس کی تفصیل خود ان کی زبان سے سنیئے۔

مولانا معین الدین، مولانا سید برکات احمد کے ہم راہ رام پور پہنچے تھے۔ وہاں جب کئی روز گذر گئے اور مولانا بہاری کی طرف سے

انعقاد مجلس مناظرہ کے باب میں تامل وتذبذب کا مظاہرہ ہوتا رہا تو ایک دن مولانا معین الدین مولانا بہاری کے پاس جا دھمکے، دو عالموں کے درمیان جب گفتگو ہوگی تو ظاہر ہے موسم پر" یا سیاسیات حاضرہ پر تو ہوگی نہیں، کسی نہ کسی علمی مسئلے پر ہی ہوگی چنانچہ ٹونک کی نسبت سے مولانا عبداللہ ٹونکی (١) کا ذکر خیر آگیا۔

فخر بہار فرمانے لگے "انہوں نے حمد اللہ کے حاشیے میں کس قدر فاش غلطی کی ہے کہ قضیے کو معقولات ثانیہ میں داخل کر دیا" یہ کہ کر فخر بہاری ان کی تحریر پر سخت تعجب کرنے لگے فقیر حقیر نے فخر بہار کے اس تعجب سے متعجب ہو کر کہا یہ فاش غلطی تو کیا غلطی بھی نہیں، اگر مولوی عبداللہ صاحب نے ایسا لکھا تو بالکل بجا اور صحیح لکھا کیوں کہ قضیے کا معقولات ثانیہ سے ہونا ایک اجماعی مسئلہ ہے" زاں بعد فقیر اس امر کا منتظر تھا اب فخر بہار کچھ ارشاد فرمائیں گے لیکن انہوں نے ایسی چپ سادھی کہ یہ مسئلہ تو درکنار وتذکرۂ اہل علم ہی کو اڑا گئے اور دوسرے رنگ میں سلسلہ سخن آغاز کر دیا" (٢)

قیام گاہ واپس آکر مولانا معین الدین نے مولانا بہاری کو ایک
تحریر بھیجی کہ جس میں انہیں اس مسئلے پر دعوت مناظرہ دی گئی تھی۔
مولانا بہاری نے اس کا جواب دیا اور اس طرح جب کئی تحریروں کا
طرفین سے تبادلہ ہونے کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو صاحب
زادہ چھٹن صاحب نے نواب سے کہ کر مناظرے کی تاریخ طے کر لی اور
[illegible] جولائی [illegible] کو یہ بزم منعقد ہو گئی۔ تجویز کی گئی کہ قضیے کے موضوع
پر مناظرہ مولانا بہاری اور مولانا معین الدین میں ہونا چاہیے کیوں کہ
انہی دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی تھی۔ مگر مولانا بہاری، مولانا
معین الدین سے مناظرے پر راضی نہیں ہوئے اس لیے بالآخر گفتگو
مولانا بہاری اور مولانا سید برکات احمد کے درمیان ہوئی۔

"حکیم صاحب (مولانا سید برکات احمد) نے اپنی
پرزور تقریر سے اس (قضیے) کا معقولات ثانیہ سے ہونا
ثابت کر دیا تو جناب مولانا مولوی عبدالوہاب صاحب
بہاری بجز اس کے کچھ نہ فرما سکے کہ یہ تو میں نے کسی
سے نہیں سنا یہ تو جدید تحقیق ہے، اس پر حاشیہ حمد
اللہ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہ سے جس
میں عبارت افق المبین یہ امر ثابت ہو رہا تھا پیش کیا

گیا جس کو حضور معلی دام ملکہم نے بذات مبارک خود جناب مولانا
مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری کو دکھا دیا۔" (۳)

رام پور میں تو مولانا بہاری، مولانا معین الدین سے مناظرے
پر آمادہ نہیں ہوئے اور استاد کی موجودگی میں شاگرد (۴) سے مناظرے
کو عار سمجھا یا بقول مولانا معین الدین

"اپنی شان بڑھانے کے لیے فقیر سے مناظرے
کو عار سمجھا اور حضرت علامہ جامع البرکات (مولانا سید
برکات احمد) مدظلہ سے مناظرے پر آمادگی ظاہر کی اور
خیال کر لیا کہ یہ وہ ذات گرامی ہے کہ جس سے شکست
کھانے میں بھی عزت ہے کہ دنیا میں ان کا متقابل ہونا
ہی بڑی بات ہے۔"

مگر بعد میں وہ مولانا معین الدین سے مناظرے پر راضی ہو گئے
تھے اور شرط یہ تھی کہ مناظرہ حیدر آباد دکن میں ہو اور اس کے حکم
فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں ہوں۔ (کھلی چھٹی) مولانا معین
الدین نے یہ شرط خوشی سے منظور کر لی تھی اور کھلی چھٹی کے جواب
میں تحریر فرمایا تھا۔

"اس دعوت کو فقیر بالراس والعین قبول کرتا

ہے بہتر ہے، حیدرآباد چلئے حضرت مولانا محمد انوار اللہ خاں صاحب دامت برکاتہم کو ہم بھی حکم تسلیم کرتے ہیں۔ اب آپ کو اس معاملے میں عجلت کرنا چاہیے جس وقت روانگی کا ارادہ ہو فقیر کو بذریعہ تار مطلع فرمایئے اور بہتر ہو کہ جناب براہ اجمیر شریف حیدرآباد تشریف لے جائیں تاکہ دونوں کا ساتھ ہو جائے، سفر کی منزلیں بحمداللطف کے ساتھ طے ہوں گی۔ الغرض فقیر ارشاد کی تعمیل کے لیے حاضر ہے (کھلی چھٹی کا کھلا جواب)

افسوس کہ حیدرآباد میں ان فضلا کے اجتماع کی نوبت نہ آسکی کیوں کہ مولانا بہاری سفر آخرت پر روانہ ہوگئے اور ارباب معقول کے اس آخری معرکے کا اچانک اور الم ناک اختتام شمس العلما مولانا عبدالوہاب بہاری کی وفات پر ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا بہاری کی وفات کی خبر سنتے ہی مولانا سید برکات احمد نے بحث و تحریر کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے انتہائی ہدایات جاری فرما دیں اور اس کے بعد چلتے ہوئے قلم رک گئے جن ہاتھوں میں اب تک

قلم رواں تھے وہ اب دعائے مغفرت کے لیے بلند تھے۔

اللھم اغفر لہ وارحم

حواشی:

(۱) شمس العلما، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی اصلاً بہاری تھے مگر ان کے والد (محمد صابر) نے ریاست ٹونک میں توطن اختیار کر لیا تھا اور مفتی صاحب ٹونک میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ٹونکی مشہور ہوئے۔ مولانا حکیم سید دائم علی عظیم آبادی اور شمس العلما، مولانا فیض الحسن سہارن پوری وغیرہ سے تلمذ تھا، ۳۴ سال اورینٹل کالج لاہور میں مدرس و صدر مدرس رہے پھر ندوۃ العلما، لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں صدر مدرس رہے۔ ۱۹۲۰ء میں وصال فرمایا، مفتی صاحب اپنے عہد کے صف اول کے علما میں ممتاز مقام پر تھے۔ تصانیف (۱) تعلیقات بر حمد اللہ، (۲) مجانبۃ الراکب فی امتناع کذب الواجب، (۳) الانوار الزاہیہ فی دیوان ابی العتاہیہ، (۴) فتاوی صابریہ (شرح محمدی) چار جلدوں میں (۵) تحریر اقلیدس کے مقالہ اول کا اردو ترجمہ، مفتی صاحب کے صاحبزادہ مفتی انوار الحق، بھوپال میں ناظم تعلیمات تھے، متعدد تالیفات کے علاوہ دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) مرتب کیا تھا۔

(۲) چہار تازیانہ قہار، ص ۴

(۳) اخبار دبدبہ سکندری رام پور شمارہ ۳۷ جلد ۵۲ - ۲۳ جولائی ۱۹۱۶ء

(۴) اتفاق ہے کہ مولانا بہاری اس استاد کے جس جس شاگرد سے جب

جب بر سر بحث و گفتگو ہوئے کامیاب و فتح مند نہیں ہو سکے۔ مولانا معین الدین سے گفتگو کا حال آپ پڑھ چکے ہیں مولانا محمد شریف سے بنارس میں گفتگو ہوئی تھی اور نتیجہ گفتگو مولانا محمد شریف کے حق میں رہا تھا۔ (حقیقت مناظرہ رام پور (۱)) مولانا مقبول احمد صاحب در بھنگوی سے پٹنہ میں مباحثہ ہوا تھا تو وہ بھی مولانا در بھنگوی کی فتح پر ختم ہوا تھا (الطامۃ الکبری ص ۳)

مناظرہ کیکڑی

برعظیم کی ملت اسلامیہ پر ایک ایسا نامسعود دور بھی گذر چکا ہے جب ہم اور ہمارے حکمراں کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ اور مسلسل جدوجہد کے بعد خود کو جہاں بانی کے لیے نااہل ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس کے نتیجے میں سات سمندر پار سے ایک قوم لاکر ہم پر مسلط کر دی گئی تھی اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ان غاصب بدیسیوں کی غلامی کے حقوق ادا کر رہے تھے۔

ان بدیسی حکمرانوں نے ہم پر اپنی حکمرانی کے استحکام کے لیے جو تدابیر اختیار کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مسلمانوں میں کئی نئے فرقے پیدا کیے، کئی سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا، چند نئے مکاتب فکر پیدا کیے، قدیم فتنوں کے اختلافات میں شدت کا رنگ بھرا اور یوں ہمیں مصروف رکھ کر خود سکون سے داد حکومت دیتے اور بے داد کرتے

رہے۔

۱۹۱۹ء میں کیکڑی ضلع اجمیر میں اہل حدیث اور احناف کے درمیان اختلافات اس درجہ شدید ہو گئے تھے کہ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی اور ایک غیر مسلم جج منصف ٹھہرا تھا۔ طرفین نے اپنے اپنے اکابر علما کو اپنے مسلک کی حمایت و دفاع کے لیے منتخب کیا تھا اہل حدیث کی طرف سے ان کے مشہور عالم اور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری بلائے گئے تھے اور احناف کی طرف سے مولانا معین الدین تھے۔ مقدمہ کئی مہینے چلا اور آخر فیصلہ احناف کے حق میں ہوا (الفقیہ امرتسر ۲۰ مارچ ۱۹۱۹ء شمارہ ۶ جلد ۲)

مدرسہ حنفیہ صوفیہ

مولانا معین الدین نے ۱۹۰۹ء میں مدرسہ معین الحق قائم فرمایا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں اسی مدرسہ نے مدرسہ معینیہ عثمانیہ کا قالب اختیار کیا اور مولانا ہی اس کے صدر المدرسین قرار پائے۔ مگر ۱۹۱۹ء میں تقریباً ساڑھے پانچ سال کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مولانا کو مدرسہ معینیہ عثمانیہ کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔

حالات کے اس رخ کی بقدر ضرورت (۱) تفصیل یوں ہے کہ

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ ہے

اور ۔

جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم ابلتا ہے

چنانچہ مدرسہ بن گیا یعنی معلم اور متعلم درس و تدریس میں مصروف ہو گئے ۔ لیکن ضرورت تھی کہ اس درسگاہ کو شکل بھی دی جائے اور نام بھی ۔ چنانچہ اہل شہر میں سے مولانا کے چند معتقدین آگے بڑھے اور اس مدرسہ کی تشکیل میں معاون ہوئے اور حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک نئے مدرسہ کا افتتاح ہوا ۔

یہ مدرسہ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں قائم کیا گیا تھا اور ۱۹۴۷ء کی ہلچل گردی اور اجمیر میں مسلمانوں کے انخلا تک ۲۸ سال قائم و باقی رہا ۔

حاشیہ

۱ ۔۔۔ ان حالات و واقعات کا کامل شرح و بسط کے ساتھ مولانا کے جواں مرگ شاگرد رشید مولوی محمد حسین مرحوم نے درۃ التاج میں بیان کیا ہے اور مراسلات، رودادوں وغیرہ سے دستاویزی ثبوت فراہم کر کے ثابت کیا ہے کہ مولانا پر یہ سازشی ماحول تنگ تر ہو گیا تھا ۔

اجمیر کے مسلمانوں کا ایک نسلی گروہ اپنی کثرت تعداد، عصبیت پر مبنی تنظیم، وسائل معاش کی فراوانی وغیرہ کی وجہ سے اجمیر کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر ہمیشہ حاوی و مسلط رہا ہے ۔ یہی گروہ نظام دکن کی آمد کے وقت مدرسہ کی تشکیل جدید میں دخیل اور اس کی منتظمہ پر بدواً و عملاً حاوی ہو گیا تھا ۔ نتیجے میں مولانا کا یہ مقصد فوت ہوا جا رہا تھا کہ تمام دیار و امصار اسلامیہ عموماً اور تمام مسلمانان اجمیر بالخصوص اس دینی و علمی درسگاہ سے مستفید ہوں ۔ اس کے برعکس مسلمانان اجمیر کا صرف ایک گروہ مدرسہ کو اور ریاست دکن کی مالی اعانت کو اپنے لئے ترجیح (بلا مرجح) پائیں ۔ مولانا سے جب تک ہو سکا اپنے رفقاء و تلامذہ کے ساتھ برسر جنگ رہے اور جب مایوس ہو گئے تو خود اپنے قائم کردہ اس مدرسہ کے انصرام و صدارت سے دست کش ہو گئے ۔

مدرسہ نام تھا مولانا کی ذات گرامی کا ۔ وہ مدرسہ سے دست کش ہوئے تو کئی مدرس اور بہت سے طلبا بھی مدرسہ سے نکل آئے ۔ مولانا معینیہ عثمانیہ سے کنارہ کش ہوئے تھے، طلبہ سے رشتہ تو نہیں توڑا تھا، کتابوں کا ساتھ تو نہیں چھوڑا تھا، تدریس سے توبہ تھوڑے ہی کی تھی، نجی طور پر درس شروع ہو گیا ۔ اور جب درس شروع ہو گیا تو مدرسہ بنتے کیا دیر لگتی ہے

انتخاب امام الہند

نومبر ۱۹۲۰ء (ربیع الاول ۱۳۳۹ھ) میں مولانا معین الدین نے جمعیۃ العلمائے ہند کے ایک اہم اجلاس (منعقدہ دہلی) میں شرکت کی اور اجلاس کی ایک نہایت اہم تجویز کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، بر عظیم کے مسلمانوں کو ایک اہم دینی و ملی فریضے کی طرف اپنے مقالات و خطبات میں متوجہ کر رہے تھے، یہ حضرات مسلمانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ ملک میں نظم جماعت قائم کر کے نصب امامت کریں، مسلم حکومت کے زوال اور غیر مسلم حاکم کی غلامی کی حالت میں مسلمانوں کے لیے شرعاً صرف دو ہی صورتیں جائز و باقی رہ جاتی ہیں:

۱.... یا وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔

۲.... یا نظم جماعت قائم کر کے اپنے ایک امیر یا امام کا انتخاب اور نصب کر لیں ورنہ ان کی زندگی غیر شرعی اور جاہلی زندگی ہوگی۔

مرتبہ اجمال میں اس تجویز پر ایک حد تک اکثر اکابر علما متفق تھے، مگر منصب امامت کے لیے مختلف اعتبارات سے موزوں تر اور

اہل تر فرد کون ہو سکتا ہے؟ اس سوال پر اختلاف تھا، ایک حلقہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (ف ۱۹۲۶ء) اور ایک حلقہ مولانا ابوالکلام آزاد پر دل نہاد تھا، مولانا آزاد، تحریک نظم جماعت کے داعی بھی تھے اور ان کے بعض رفقائے نے ان کے انتخاب کے لیے خطوں اور ملاقاتوں کے ذریعے راہ ہموار بھی کی تھی اور بالخصوص مولانا محمود الحسن شیخ الہند کو اپنا پر جوش ہم نوا بنا لیا تھا اور وہ کسی امام الہند سے بیعت کے لیے اپنی بے تابی کا اظہار فرما چکے تھے۔ چنانچہ اس حلقے نے جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس (منعقدہ دہلی ۱۹-۲۰-۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء) مولانا آزاد کے امام الہند منتخب کر لئے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا، اجلاس میں مولانا آزاد نے امارات شرعیہ کے قیام اور اس کے وجوب اور مصالح و منافع پر ایک نہایت مدلل و مفصل اور مرصع و موثر تقریر کی اور متعدد علما خصوصاً مولانا ابوالمحاسن سجاد نے تجویز کی حمایت میں پرزور تقاریر کیں مولانا محمود الحسن کی حمایت پہلے ہی زبان زد تھی، ان تقاریر کے نتیجے میں صرف وہی ایک حلقہ نہیں جو پہلے سے اس کے لیے آمادہ ہو کر آیا تھا اور اس تحریک کے موئیدین میں سے تھا بلکہ تمام ہی علما اتنے مسحور و متاثر ہوئے کہ مولانا آزاد کے ہاتھوں پر امامت ہند کی بیعت کے لیے ہر فرد کا دست بیعت دراز تھا۔

یہ نازک اور فیصلہ کن لمحہ تھا جب مولانا معین الدین کھڑے ہوئے اور انہوں نے مختصر وقت میں بڑے موثر الفاظ میں معشر علما کو اس طرف متوجہ کیا کہ قیام نظام جماعت اور نصب امارت و امامت کی اہمیت و وجوب سے کسی کو انکار نہیں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ امام الہند کا انتخاب آج ہی کر گذریں اور مولانا آزاد ہی کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنے ہی تدبر، ہوش مندی اور صبر و سکون سے فیصلے کا بھی متقاضی ہے۔ اتنے اہم مسئلے کا فیصلہ عجلت و شتابی اور جذباتی فضا میں کرنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ ہم سب کو غور و فکر اور باہم تبادلہ خیال کا موقع ملنا چاہیئے تاکہ کوئی صحیح اور انسب فیصلہ کیا جاسکے اس لیے چند دن کے لیے یہ فیصلہ ملتوی کر دیا جائے۔

اس تقریر سے ایک طرف وہ جذباتی فضا چھٹ گئی جو مولانا آزاد کی پر جوش خطابت سے طاری ہوئی تھی، دوسری طرف مولانا معین الدین کی تجویز التوا کی معقولیت کیساتھ ان کے بے باکانہ انداز بیان نے دوسرے شرکاء کو جرات عطا کی اور اس کے بعد کئی علما مثلاً مولانا انور شاہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے التوا کی حمایت میں تقاریر کیں اور اب اجتماع کا رنگ یہ تھا کہ گویا یہی بہت سے علما کے دل کی آواز ہے۔

چنانچہ نصب امامت کی تجویز ملتوی کر دی گئی۔

۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جمعیۃ العلما کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا، اس اجلاس کے ایجنڈے میں دوسرے مسائل کے ساتھ انتخاب امام کا مسئلہ بھی تھا، لیکن اس اجلاس میں بھی انتخاب امام کا مسئلہ جمعیۃ کے سالانہ اجلاس عام پر معوق کر دیا گیا، جو لاہور میں ہونے والا تھا، چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جو اجلاس مولانا آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا اس میں بھی مولانا آزاد امام الہند منتخب نہ ہو سکے۔

توضیحات

مندرجہ بالا معلومات بیشتر زبانی روایات پر مبنی ہیں۔

○ ... مولانا کے برادر زادہ گرامی اور شاگرد مولانا حکیم محمد نصیر الدین ندوی
(نظامی دواخانہ، کراچی)

○ ... مولانا کے برادر خورد مولانا غازی محی الدین اجمیری (ف ۱۹۷۰ء)

○ ... مولانا حکیم پیر ہاشم جان سرہندی (ف ۱۹۷۵ء)

○ ... مولانا منتخب الحق (ف ۱۹۸۸ء)

○ ... مولانا عبدالشاہد خاں شروانی (ف ۱۹۸۴ء)

○ .... مولانا سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی

○ .... حکیم پیر سلیم جہان سرہندی مدظلہ (ماگلی، سندھ)

○ .... مولانا سید حاتم علی رام پوری مرحوم خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا معین الدین کا ایک مکتوب بھی پیش نظر ہے جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ہے مگر ماہنامہ میثاق (لاہور) کے مطالعے کے بعد چند توضیحات کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، غیر ضروری تفصیل میں جائے بغیر جو سوالات سامنے آئے ہیں ان کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ مولانا معین الدین نے یہ تقریر جمعیۃ کے کس اجلاس میں کی تھی؟ جمعیۃ کا دوسرا سالانہ اجلاس مولانا محمود الحسن کی صدارت میں دہلی میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں بھی ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں ہوا تھا۔ تیسرا سالانہ اجلاس (زیر صدارت مولانا آزاد) لاہور میں ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوا تھا۔ ان جلسوں میں سے مولانا معین الدین کی تقریر التواء، سالانہ اجلاس دہلی (نومبر ۱۹۲۰ء) میں ہوئی تھی، صدر اجلاس مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) تھے تجویز انتخاب امام مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نے پیش کی تائیدی تقاریر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا شبیر احمد

عثمانی اور مولانا آزاد نے کیں التواء کی تجویز مولانا معین الدین نے کی خود مولانا نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام اپنے مکتوب میں لکھا تھا

"حالی الاہی علماء ان (مولانا آزاد) کی تقریر سے متاثر ہوئے اگر من جانب فقیر اس (انتخاب امام کے التواء) کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اس وقت اس مسئلے کو طے کر لیتے"

یہ مکتوب ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا تھا، ظاہر ہے کہ مذکورہ تینوں اجلاسوں میں سے ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء سے قبل صرف نومبر ۱۹۲۰ء کا اجلاس تھا جس کی روداد مولانا نے اپنے قلم سے لکھی ہے۔ اس تعیین و توضیح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ زمانہ اور طول عہد کی بنا پر بہت سے حضرات نے اس واقعے کو اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) کا بتایا ہے۔ جناب امیر اللہ خان عزیز نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سوال کے جواب میں لکھا تھا

"۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس بریڈلا ہال لاہور میں ہوا تھا اس موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر بیعت کر لی جائے گی

لیکن بعد میں کچھ نہ ہوا اور معلوم ہوا کہ اندرون خانہ دیوبندی علما میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور غیر دیوبندی علما میں سے مولانا معین الدین اجمیری نے شدت سے مخالفت کی تھی۔ (میثاق لاہور ۳۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

یہی بات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے میرے نام ایک مکتوب میں ظاہر کی تھی۔

مجھے، جہاں تک یاد ہے یہ اجتماع لاہور میں ہوا تھا نہ کہ دہلی میں ۔۔۔۔ جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس میں، میں شریک تھا، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ امام الہند کے انتخاب میں بعض اکابر علماء مانع ہوئے تھے اور یہ انتخاب نہ ہو سکا تھا۔

ہوا یہ کہ قیام نظام جماعت اور نصب کی دعوت (۱) تو کئی سال سے دی جا رہی تھی مگر مولانا محمود الحسن کی رہائی اور مراجعت ہند (جون ۱۹۲۰ء) کے بعد اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی۔ مولانا محمود الحسن، مولانا آزاد کے الہلال سے بھی متاثر تھے اور اب ان کی نگاہ انتخاب مولانا آزاد پر لگی تھی، چنانچہ انہی کے تلامذہ مفتی کفایت اللہ اور مولانا

احمد سعید دہلوی نے اس تجویز کی تائید میں حصہ لیا تھا مگر باقی تمام شرکاء اجلاس علماء یا تو معاون الدین اور لاعلم تھے یا جن کو اس کی سن گن لگ گئی تھی وہ مختلف اسباب و جہات سے مولانا آزاد کی امامت سے خوش نہیں تھے۔ بعض اختلاف مسلک فقہی کے زیر اثر، بعض مولانا کی غیر ثقہ عادات (مثلاً حقہ نوشی، غیر عالمانہ، وضع قطع) اور بعض مولانا کی کم عمری و ناتجربہ کاری کے پیش نظر مذبذب و متامل تھے۔ لیکن جب مولانا معین الدین نے ان کے جذبات کو زبان دی اور انتخاب کو ملتوی کروا دیا پھر علماء کے یہ مختلف گروہ بیدار اور سرگرم ہو گئے اور اب تحریک پس منظر میں چلی گئی۔ مولانا آزاد کے ہم نوا اور معتقدین کی مساعی جاری ہوں گی اس لیے ستمبر ۱۹۲۱ء میں مجلس منتظمہ بلائی گئی جس کے ایجنڈے کا ایک اہم نکتہ یہی مسئلہ تھا مگر یا تو مولانا معین الدین اس مجلس منتظمہ کے رکن نہیں ہوں گے یا کسی وجہ سے اس مجلس میں ان کی شرکت یقینی نہیں ہوگی اس لیے اس مذبذب و متامل گروہ کی طرف سے جو اب فعال ہو گیا تھا مولانا معین الدین کو خصوصیت سے مدعو کیا جا رہا تھا۔

- علماء دہلی (۲) کا خیال کہ فقیر خصوصیت کے ساتھ اس جلسے میں شریک ہوا۔ (مکتوب)

۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کی دہلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت جمعیۃ علما کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں اس مسئلے سے متعلق کیا طے کیا گیا اس کا اندازہ مولانا آزاد کے اس جملے سے ہوتا ہے جو مولانا نے لاہور کے اجلاس سے خطبہ۔ صدارت میں کہا تھا۔

"گذشتہ موسم گرما میں اس طرف سے مایوسی ہو
گئی کہ تمام ملک کے لیے کوئی متحدہ و متفقہ نظم قائم ہو"

پھر نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا آزاد نے ہی کی اس اجلاس میں پندرہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی جو امیر شریعت (امام منتخب) کے اختیارات و فرائض کا تعین کر کے بدایوں میں ہونے والے سالانہ اجلاس میں اپنی تجاویز پیش کرے۔ دوسری بات مولانا معین الدین کی تقریر کے سلسلے میں یہ کہی گئی ہے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں مولانا آزاد کی امارت کے لیے ناموزوں قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ ایاز قدر خود شناس، کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب تم ایسے نوعمر کو تو اکابر علما کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں ہے۔ رہا تمہارا علم و فضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے۔ ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو" اور اس روایت کے

راوی ہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی تو جس طرح چشتی صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا سن ۲۰ نہیں، ۲۱ بھی نہیں ۲۲ بتایا ہے جو لازماً غلط ہے اس لیے کہ ۱۹۲۲ء میں مولانا آزاد، آزاد نہیں بلکہ اسیر فرنگ تھے۔ اس طرح یہ تقریر بھی سراسر بے اصل و اساس ہے اولاً اس لیے کہ ہم اہل حلقہ نے اس واقع کے سلسلے میں یہ نہیں اس سے ملتی جلتی بات بھی نہیں سنی، حال آں کہ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، متعدد ایسے حضرات سے میں نے بار بار یہ واقعہ سنا ہے اور انہوں نے خود مولانا معین الدین سے اس واقعہ کی جزئیات بار بار سنی تھیں بلکہ ان میں سے مولانا کے برادر خرد مولانا غازی محی الدین تو اس اجلاس میں شریک بھی تھے۔ ثالثاً مولانا معین الدین جیسے عالی ظرف اور شائستہ بزرگ کا یہ انداز گفتگو ہی نہیں تھا۔ ثانیاً مولانا معین الدین اور مولانا آزاد کے روابط ہمیشہ مخلصانہ رہے دونوں ایک دوسرے کے قدر شناس اور مداح رہے، مولانا کے عزیز شاگرد اور برادر زادہ گرامی، مولانا حکیم نصیر الدین ندوی ان دونوں حضرات کی ایسی بکثرت ملاقاتوں اور طویل طویل نشستوں، علمی مذاکرات اور محافل طعام کے شاہد ہیں۔ رابعاً مولانا آزاد اگرچہ اس وقت ۳۳ سال کے تھے مگر خود مولانا معین الدین اس وقت اپنی عمر کے ۳۹ ویں سال میں تھے اس لیے مولانا آزاد

کی نوعمری کا ذکر تو ان پر اس وقت بجتا بھی نہیں تھا۔ خاصاً منطق کی کسی کتاب کی عبارت تو امتحان کے لیے موزوں بھی نہیں ہوتی، ادب و تاریخ کی کتابوں میں ذخیرہ الفاظ وافر ولا محدود ہوتا ہے، عبارت آرائی ہوتی ہے زور کلام کا اظہار ہوتا ہے، غرائب اللغات ہوتے ہیں، اس لیے ان کتابوں کی عبارت خوانی میں رجال واماکن واقوام وغیرہ کے اسماء کے تلفظ میں غلطی کے امکانات ہوتے ہیں، فنی کتابوں کی عبارت کا مفہوم تو بے شک عسیرالفہم اور عام دست رس سے بلند ہوتا ہے مگر عبارت تو مشکل نہیں ہوتی، سادساً خود مولانا آزاد نے اپنے لیے دعوت بیعت کب دی تھی جوان کی عمر اور علم کو معرض نقد وامتحاں میں لایا جاتا، سابعاً التوا۔ انتخاب کے لیے عجلت سے احتراز اور طلب مہلت کا نکتہ کیا کم موثر اور معقول تھا کہ مولانا آزاد کے قامت کی پیمائش کی ضرورت لاحق ہو جاتی۔

واقعہ یہ ہے کہ غور وفکر کے لیے مہلت طلب کی گئی تھی اور مولانا آزاد کے حامیوں کو بھی اس کے وزن کو تسلیم کرنا پڑا اور مذبذبین ومنکرین کو بھی حیلہ ہاتھ آگیا اور انتخاب امام معرض التوا میں آگیا اور افسوس ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر ملتوی ہی ہو تا گیا۔

حواشی:

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بھولے ہوئے سبق کو یاد دلایا (صفحہ ۹ ہندوستان اور مسئلہ امارت از مولانا عبدالصمد رحمانی ۱۹۶۹ء) مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی یہی لکھا ہے۔۔اس سلسلے میں قیادت کے اور سبقت واولیت کی سعادت اللہ تعالے نے مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں لکھی تھی صفحہ ۲۲ امارت شرعیہ از مولانا محمد ظفر الدین ۱۹۷۳ء۔ اس طرح امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے ادبیات میں داعی اول کی حیثیت سے مولانا ابو المحاسن کا نام لیا گیا ہے مگر میرے خیال میں اس تجویز کے داعی اول مولانا آزاد ہی تھے، مولانا آزاد نے اپنے اجلاس لاہور کے خطبہ صدارت میں بیان کیا تھا کہ مولانا ابو المحاسن کو انہوں نے (اپنی رانچی میں نظر بندی کے دوران) اس طرف متوجہ کیا تھا اور امارت شرعیہ کی دعوت پر انہیں مامور کیا تھا۔ (صفحہ ۴۳ تحریک نظم جماعت ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)

(۲) یہ علماء دہلی کون کون تھے، یہ تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن مجلس کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خاں تھے۔ جو اس تجویز سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ وہ اسے خطرناک راستہ سمجھتے تھے۔ صفحہ ۱۴۵ سیرت اجمل

فتوے حرمت

۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا نے اجمیر میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک "باغیانہ" تقریر کی جس پر برطانیہ کی فوج اور پولیس میں ملازمت کی حرمت کا فتویٰ دیا اور ۲۹ نومبر کو گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور ۱۳ فروری ۱۹۲۲ء کو "منصف" نے فیصلہ سنا دیا، مولانا کو ۱۸ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کی ایک شب جامع التمش اجمیر میں مولانا کی تقریر کا اعلان ہوا۔ مولانا اہل اجمیر کی محبوب شخصیت تھے، مسلمان ان کی تقریر کے لیے سراپا گوش رہتے تھے، وہ تقریر بھی ایسی کرتے تھے کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کثیر مجمع جمع ہو گیا کہتے ہیں جیسے پورا اجمیر امنڈ آیا تھا، مولانا تشریف لائے اور اپنے تلامذہ کے اس گروہ کے ساتھ آئے جو علم کے طالب بھی تھے اور آزادی وطن کے والہ و شیدا، بھی موضوع تھا۔

"حرمت ملازمت فوج و پولیس حکومت برطانیہ"

آج تو برعظیم آزاد ہو چکا ہے اور وطن عزیز پر اغیار کا تسلط نہیں رہا۔ اس لیے صورت حال ہی دوسری ہے، آزادی سے چند سال پہلے بھی مولانا جیسے سرفروشوں اور "باغیوں" کے بغاوت کے جنون کو عام

کر دیا تھا اور بچے بچے کی زبان پر آزادی وطن کا نعرہ تھا اور برعظیم ہر باشندے کے دل میں استخلاص وطن کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ اس تڑپ کے اظہار کی جرأت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریز کا خوف دل سے نکل گیا تھا۔ انگریز کی فوج اور پولیس کی دہشت دل سے نکل گئی تھی۔ مگر تصور کیجیے آج سے ۷۰ سال پہلے کا جب یہ کیفیت نہیں تھی۔ اس وقت عوام ایسی باتیں کہتے ہوئے نہیں سنتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ بغاوت کرنے سے نہیں باغیانہ تقریر سے خوف کھاتے تھے، یہ ماحول اور یہ رنگ تھا جب فتوائے حرمت کی وضاحت کے لیے مولانا کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ مولانا پہلے سے فتویٰ مرتب کر کے لائے تھے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ برطانیہ کی فوج اور پولیس کی ملازمت حرام ہے، حکومت برطانیہ دشمن اسلام ہے، ہر مسلمان فوجی اور ملازم پولیس کا فرض ہے کہ اس ملازمت کو ترک کرے اور استیصال حکومت برطانیہ کے لیے کوشش کرے جس طرح یہ حکومت اسلام کے استحصال کے کوشاں ہے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے گھر جا کر اس پر غور کریں اور غور کرنے کے بعد میرے پاس آکر تقسیم کرنے کے لیے فتویٰ طلب کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ

وقتی جوش میں آکر آپ اپنے آپ کو پیش کردیں بلکہ
خوب غور کرلیں اور صرف وہ لوگ میرے ساتھ آئیں
جو جیل جانے اور ہر طرح کی مصیبت برداشت کرنے
کے لیے تیار ہوں۔"

مولانا معین الدین کا یہ طرز عمل ان عام سیاسی رہنماؤں کے طرز عمل سے بہت مختلف تھا جو عوام کو الفاظ کی ساحری سے جوش میں لاکر، نعرے لگاکر اور جذبات میں ہیجان پیدا کرکے اپنی بات منوالیتے ہیں اور اپنے من مانے اقدامات ان سے کروالیتے ہیں۔ مولانا کی زبان میں جادو تھا اللہ تعالے نے ان کو فقید المثال طلاقت لسانی عطا فرمائی تھی، وہ زور بیان کی ایسی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ جو چاہتے مخاطب وہی کہنے لگتے۔ مگر انہوں نے یہ پسند نہیں کیا، وہ عوام کو غور وفکر کی تربیت دینی چاہتے تھے۔ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی عادت ڈالنا چاہتے تھے اور نتائج کی تفصیلات پر غور کر لینے کے بعد اقدام کا مشورہ دیتے تھے۔ اس لیے انہوں نے وقتی جوش میں آکر خود کو پیش کردینے سے لوگوں کو منع کیا اور وقت دے کر کہا کہ جو لوگ ان عواقب وشدائد کے لیے آمادہ ہوں، وہ میرے ساتھ آئیں اور مطبوعہ فتوے تقسیم کرنے کے لیے خود کو بطور رضاکار پیش کریں۔

غور وفکر کی مہلت دینے کے باوجود نیک نیت، اخلاص شعار اور سحر کار مقرر کے زور تقریر کا یہ اثر ہوا کہ

"ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ شہادت
دی کہ ماہ دسمبر ۱۹۲۱ء کے ابتدائی دس روز میں مجھ کو
تقریباً تیس افسروں اور سپاہیوں کے استعفے موصول
ہوئے جن میں سے کم از کم ستر فی صد استعفوں میں یہ
بیان کیا گیا تھا کہ پولیس کی ملازمت حرام ہوگئی ہے اور
علمانے اس کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے"

بھلا ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ ایسی خطرناک تقریروں کو ٹھنڈے پیٹوں سن سکتی تھی اور جب کہ تقریر کے اثرات عملی طور پر مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے اور ملازمین استعفی دے رہے تھے اور استعفوں میں فتوے کا حوالے دے رہے تھے۔ چنانچہ ابروئے حکومت پر شکنیں ابھر آئیں ۱۰ نومبر کو یہ تقریر ہوئی تھی ۲۹ نومبر کو مولانا اپنے ہم نوا اور ہم قدم تلامذہ اور معتقدین کے ساتھ گرفتار کرلیے گئے۔ سماعت شروع ہوئی۔ مولانا کو منصف نے ملزم نمبر ۱ بتاکر بیان دینے کو کہا۔ "ملزم نمبر ۱" سن کر مولانا چونک گئے اور اپنے بیان کا آغاز اس شعر سے کیا۔

میں تو سمجھا تھا کہ مجھ جیسے سبھی ہیں مجرم
خوبی بخت کے مقتل میں ، میں اول نکلا

مولانا نے اپنے بیان میں حکومت برطانیہ سے اپنی عداوت اور اس کے استیصال کے لیے اپنی کمر بستگی کا اظہار کیا اور کہا "کہ ہم اپنی تمام قوت اور اس کے وسائل استعمال کریں گے" مولانا نے چیلنج کیا کہ ہم تمہارے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے تباہ کرنا چاہتے ہیں - مولانا کا استدلال یہ تھا کہ برطانیہ نے اسلام کے ساتھ معاندانہ سلوک کیا ہے لہذا وہ اسلام دشمن ہے اور قرآن شریف کی رو سے دین دار مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے دشمنوں سے لڑیں -

مولانا نے یہ فتویٰ دیا اس کو نشر کیا، اس کو طبع کروا کے تقسیم کیا پھر مقدمہ چلا تو عدالت میں صاف صاف اپنے جرم کا اقرار بھی کیا نہ صرف اقرار بلکہ اپنے دو آتشہ باغیانہ جذبات کا بھی اظہار کھلے کھلے الفاظ میں کیا، بھلا اب قانون کو حرکت میں آنے سے کون روک سکتا تھا؟ تعزیرات ہند کی کئی دفعات ان جرائم پر منطبق ہونے کے لیے بے تاب تھیں اور کتنی ہی سزائیں ان مقدس گناہوں سے منسوب ہونے کے لیے مضطرب! ۲۱ فروری ۱۹۲۲ء کو فیصلہ سنا دیا گیا، ملزم نمبر ۱ کے لئے اٹھارہ ماہ قید بامشقت تجویز کی گئی - یہ کیا" بامشقت ہی مگر رہی تو

قید ہی، ملزم نمبر ۱ کی حسرت ایک بار پھر دل کی دل میں رہ گئی - جذبہ شوق شہادت پھر بے اثر نکلا -

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

مولانا کی آنکھیں اشک آلود تھیں، آنسو خوشی کے نہیں تھے، غم کے تھے مگر غم کاہے کا!

عقوبت بقدر جرم نہیں تھی
یاراں مگر ایں شہر شماسنگ ندارد

کرسی اور کٹہرے کا ڈرامہ دیکھتے دیکھتے صدیاں بیت گئیں مگر تاریخ کا دل نہیں بھرتا ہر صدی، ہر دور، ہر خطے، ہر مقام پر وہ یہ ڈرامہ اسٹیج کراتی ہے اور مزے لے لے کر دیکھتی ہے، کرسی وہی ہوتی ہے، کٹہرا وہی ہوتا ہے، کردار بدل جاتے ہیں، مگر ان کا کردار وہی رہتا ہے، کرسی پر ہر بار منصف کی عبا پہن کر وقت کا کوئی جابر بیٹھتا ہے اور کٹہرے میں ہتھکڑی پہن کر وقت کا کوئی یوسف کھڑا ہوتا ہے اور وہی پرانی کہانی ہر بار دہرائی جاتی ہے -

وہی مقدس جرم، وہی سنگیں سزا!

مولانا معین الدین کی گرفتاری سے پہلے طالبان علوم کی ایک جماعت ان سے سرگرم استفادہ تھی، مختلف علاقوں اور مختلف ممالک سے آئے ہوئے ان طلبہ میں صاحب زادہ ہاشم جان بھی تھے، یہ شیخ مجدد کے اسلاف میں سے۔ سندھ کے ایک سربرآوردہ اور اہل علم خانوادے کے نوجوان وہ ٹنڈوں سائیں داد (حیدر آباد، سندھ) سے پڑھنے کے لیے مولانا کی خدمت میں آئے تھے اور ان دنوں قطبی و میر قطبی زیر درس تھیں۔ مولانا اپنے باغیانہ فتوے کی پاداش میں جیل بھیج دیئے گئے اور درس وافادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر نہیں، درس وافادہ کا سلسلہ جاری رہا۔

علم سے شغف اور شیفتگی کی یہ کیسی نادر مثال ہے کہ جرم بغاوت کی پاداش میں طوق بگلو اور سلاسل بپا ہیں، دار ورسن کی منزل درپیش ہے ہر نوع کی مشقتوں اور شدائد سے دوچار ہیں مگر خیال آتا ہے تو طلبہ کا یاد آتی ہے تو چھوٹے ہوئے اور ادھورے درس کی پنسل اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کس طرح میسر آجاتے ہیں اور قطبی و میر قطبی کا درس شروع ہو جاتا ہے۔ درس زبانی نہ سہی، قلمی سہی، بالمشافہہ نہ سہی بالواسطہ ہی، آنکھوں میں تو دم ہے۔

مولانا معین الدین کے قطبی خواں طالب صاحبزادہ ہاشم جان بعد میں "مولانا حکیم حافظ ہاشم جان سرہندی" کہلائے اور پاکستان میں صف اول کے عالم دین، مرشد طریقت اور ممتاز معالج کی حیثیت سے نام ور ہوئے۔ مولانا کے یہ "اسباق مجلس" یا مکتوبات درس، سعید شاگرد نے سنبھال کر رکھے۔ برسوں بعد مولانا حکیم نصیر الدین ندوی کے ارشاد پر خاکسار نے ان کو نقل کر کے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا اور یہ کتاب معین المنطق کے نام سے شائع ہوئی۔

مااہل بہ لغیر اللہ

مولانا معین الدین کے پاس ایک استفتا اور بعض معاصر علما کی طرف سے اس کا فتویٰ آیا جس میں ان جانوروں کی حلت و حرمت کے لیے سوال کیا گیا تھا جنہیں کسی بزرگ کے ایصال ثواب کی نیت سے پالا گیا ہو مگر انہیں کو ذبح کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر، آیا وہ حلال ہے یا حرام۔ مفتی حضرات نے ایسے ذبیحے کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا اور استشہاد میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوے کا بھی ذکر کیا تھا، کہ ان کے نزدیک ذبح کے وقت رفع صوت بذکر اللہ کا اعتبار نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت نیت و نامزدگی کی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی

حکیم الامۃ کا قول بھی نقل کیا گیا تھا کہ انہوں نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ رفع صوت بذکر اللہ کے باوجود غیر اللہ کی نامزدگی کی وجہ سے یہ ذبیحہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہو گا۔

افسوس ہے کہ استفتا اور مفتی حضرات کا فتویٰ محفوظ نہیں رہا مولانا کا فتویٰ محفوظ رہا اور طبع ہو گیا ہے (لاہور ۱۹۹۲ء)

مولانا ذبیحے کی حلت کے قائل ہیں اور انہوں نے اپنے مفصل فتوے میں شاہ صاحب اور مولانا تھانوی کی آرا کا مدلل رد کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ کتب لغات (القاموس المحیط اور منتہی الارب) اور تمام تفاسیر قدیمہ میں اہلال کے معنی رفع صوت لکھے ہیں اور اس کے استعمالات میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی امر باطن و مخفی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس میں نیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جمہور علما و فقہا کا مسلک بھی یہ ہے کہ ذبیحے کی حلت و حرمت کا مدار ذکر وعدم ذکر پر ہے نہ کہ کسی دوسری شئے پر خواہ وہ نذر ہو یا نامزدگی چنانچہ اگر کسی مجوسی کا جانور اس کے آتش کدے کے لیے یا کسی بت پرست کا اس کے بت کے لیے کسی مسلم نے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا۔ تو وہ ذبیحہ حلال ہو گا، ان دونوں صورتوں میں فقہا نے نیت و نذر کا اعتبار نہیں کیا۔ نیت آتش کدے یا بت کدے کی تھی۔ مگر ذبح چوں کہ مسلم نے

کیا اور اللہ کا نام لے کر کیا۔ اس لیے ذبیحہ حلال ہو گیا (عالم گیری، تاتار خانیہ، جامع الفتاویٰ)

سیال شریف میں

اس زمانے میں چند سال کے لیے مولانا کو پنجاب کے بعض معتقدین و تلامذہ کے اصرار پر سیال شریف منتقل ہونا پڑا وہاں مدرسہ شمسیہ ضیائیہ کی صدارت مولانا کے سپرد کی گئی۔ خانقاہ سیال شریف کے موجودہ سجادہ نشین مولانا قمر الدین صاحب اور حضرت علامہ مولانا سید منتخب الحق قادری (صدر شعبہ معارف اسلامیہ کراچی یونیورسٹی کی تکمیل و فراغت اور دستار بندی اسی عہد اور اسی مدرسہ میں ہوئی تھی۔ ان حضرات کے علاوہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد مولانا سے مستفید ہوئی اور دار العلوم کے موجودہ ناظم اعلیٰ ڈاکٹر تسخیر احمد نے جو سوا سو سالہ روداد دار العلوم شائع کی ہے اس کی روشنی میں تو تاریخ دار العلوم میں سب سے زیادہ رونق سب سے زیادہ تعداد طلبہ مولانا کے عہد صدارت میں رہی تھی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا

سیال شریف میں مولانا کا قیام زیادہ نہیں رہا۔ آستانہ اجمیر کی

کشش جلد ہی مولانا پر غالب آگئی اور آپ مراجعت فرمائے اجمیر ہو گئے۔

منتظر ۔ مزار حضرت خواجہ نہ چھوڑئے
اجمیر کے دیار سے جانا نہ چاہیے

مولانا کے قیام سیال شریف کے ایک یادگار علمی معرکے کا تذکرہ موجب دلچسپی ہوگا۔ اس وقت کے صاحب سجادہ مولانا ضیاء الدین نے مولانا سے فرمایا کہ یہاں عرصے سے علما کے دو گروہ ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب پر مباحثہ ہو رہا ہے ازراہ کرم آپ اس سلسلے میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ مولانا نے دونوں گروہوں کے علما کے اجتماع میں منکرین علم غیب علما خصوصاً مولوی حسین علی صاحب سے دریافت کیا کہ اختلاف رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب وعدم علم غیب میں ہے۔ آپ کی نبوت میں تو نہیں ہے ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ نبوت میں اختلاف وشک کسی مسلمان کو کیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ بس تو آپ حضرات حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں تو گویا علم غیب کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ نبوت کے معنے ہیں خبر دینا۔ تو حضورؐ یہ خبر دینے تو تشریف لائے نہیں تھے، نہ ان خبروں کی کوئی اہمیت ہوتی

ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور پانی تشنگی رفع کرتا ہے۔ آگ جلاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ایسی خبریں تو ہر شخص دیتا ہے اور دے سکتا ہے۔ مگر ہر شخص کو نبی نہیں کہا جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس بناء (خبر) کی نوعیت مختلف ہوتی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے اور وہ خبر ان خبروں سے متعلق ہوتی تھی جو ہمارے دائرہ علم وخبر سے خارج ہوتی ہیں۔ بس اسی کا نام علم غیب ہے۔ تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانتے ہیں ان کو تو علم غیب مانے بغیر چارہ نہیں ہے، ہاں علم غیب کے انکار کی ضد میں کوئی نبوت ہی کا انکار کر بیٹھے تو وہ جدا بات ہے۔

اجلاس جمعیۃ کی صدارت

مئی ۱۹۳۰ء میں مولانا نے جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ امروہہ (یوپی) کی صدارت فرمائی۔ یہ اجلاس جمعیۃ کا نواں سالانہ اجلاس تھا۔ اس سے پہلے جمعیۃ کے اجلاسوں کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمن عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید محمد سجاد بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید انور شاہ کشمیری فرما چکے

تھے، اور اس کے بعد کے اجلاسوں کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد،
مولانا عبدالحق مدنی اور مولانا سید حسین احمد وغیرہ نے کی۔ اس سے
اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کو علمائے ہند کی صف اول میں مقام
رفیع حاصل تھا اور مرکزی مسلم سیاست میں مولانا کی اہم حیثیت تھی
جمعیۃ العلمائے ہند نے ایک ایسے دور میں مولانا کو صدارت سونپی تھی
جو برصغیر کی جنگ آزادی کا ایک نازک دور تھا۔

۲۸ء میں برصغیر میں نفاذ اصلاحات جدیدہ کی تحقیق کے لئے
حکومت برطانیہ کی طرف سے سائمن کمیشن آیا تھا۔ اس سلسلے میں وزیر
ہند لارڈ روکن ہیڈ نے اہل ہند کو دعوت دی تھی کہ وہ کوئی ایسا دستور
اساسی اس کمیشن کے سامنے پیش کریں جس پر تمام اہل ہند کے تمام
طبقات اور گروہوں کا اتفاق ہو۔ اس دعوت کے جواب میں مشہور
زمانہ نہرو رپورٹ مرتب کی گئی مگر اس پر اتحاد واتفاق نہ ہو سکا۔ اور
بالآخر رد کر دی گئی اور اہل ہند نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔
ہڑتالیں ہوئیں احتجاج ہوئے اور اس کے جواب میں حکومت کی طرف
سے لاٹھیاں برسیں اور گولیاں چلیں، حکومت کے طرز عمل سے عوام
کا ہیجان بڑھتا گیا اور غیر ملکی کپڑے اور کمات کا مقاطعہ کیا گیا۔

۲۹ء میں لارڈ ارون نے انگلستان سے واپس آکر ایک ایسا اعلان

کیا جس سے ہندوستان کو درجہ مستعمرات دیئے جانے کا مبہم سا وعدہ
مترشح ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے لارڈ سے اس کی وضاحت چاہی اور خاطر
خواہ جواب نے ملنے پر جنوری ۳۰ء میں تمام ملک میں یوم آزادی منایا
گیا اور گاندھی جی نے نمک کے قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنا مشہور
پاپیادہ سفر شروع کیا۔

کچھ ہی دن قبل مشہور مہا سبھائی رہنما مسٹر ہربلاس شاردھا اپنا
بدنام زمانہ شاردھا بل پیش کر چکے تھے۔ جس پر مسلمانوں میں غیر
معمولی غم وغصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانان ہند
کی مذہبی جماعت کی صدارت کے لیے ایک ایسے عالم کے انتخاب کی
ضرورت محسوس ہوئی جو۔

۱.... نہ بریلوی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، نہ دیوبندی فقطہ نظر کا حامی
ہو۔

۲.... جو کانگریس کی حمایت اور بہر حال ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں،
مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح راسخ العقیدہ بھی نہ ہو۔

۳.... جو ایک معتمد وموقر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ حالات
حاضرہ سے باخبر ہو۔ ملکی سیاست پر گہری نگاہ رکھتا ہو۔ سیاسی مسائل
میں اس کی ایک رائے ہو جو اس کی اپنی ہو۔ پھر وہ اس پر دلائل بھی

رکھتا ہو جو نہ انگریز دشمنی میں اس حد تک اعتدال سے متجاوز ہو کہ انگریزوں کے خلاف خنازیر و کلاب سے بھی اشتراک و تعاون پر بدل وجان آمادہ ہو، جیسے مولانا سید حسین احمد مدنی مرحوم نہ مطالبہ، حقوق پر اس درجہ بضد ہو کہ اصل مقصود حصول آزادی تک کو تج دینے میں دریغ نہ کرے۔

ان سب شرائط کو جو شخصیت پورا کرتی تھی وہ مولانا معین الدین اجمیری کی شخصیت تھی۔ چنانچہ مولانا کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اور وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے۔

مولانا نے اپنے خطبہ، صدارت (۱) میں اس دور کے سب سے اہم مسئلہ شاردا ایکٹ پر ایک بھرپور اور تنقیدی نظر ڈالی۔ اس ایکٹ کی رو سے صغر سنی کے نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کا ایک مذہبی حق سلب ہوتا تھا۔ مولانا نے سب سے پہلے تو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمل سلب حقوق اور مداخلت فی الدین کا تاریخی جائزہ لیا اور بتایا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۶۵ء سے عہد حال تک پانچ مراحل میں دینی امور میں مداخلت اور مسلمانوں کے سلب حقوق کی مہم انجام دی اور اب صحیح وقت پر شاردا ایکٹ نافذ کیا گیا۔

شاردا ایکٹ کے متعلق کس قدر صحیح اندازہ مولانا نے فرمایا تھا:

"شاردا ایکٹ کو بظاہر صرف نکاح صغر سنی کو حاوی ہے، لیکن اس کی تہ میں جو چیز کام کر رہی ہے وہ تمام اسلامی احکام کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ وہ صرف ناموس شریعت ہی کو نہیں اصل شریعت کا استیصال کرنے والی ہے۔ عرصہ دراز سے منصب قضا سلب کر کے برطانوی ججوں کو دے دیا گیا تھا۔ صرف منصب افتا مسلمانوں کے پاس باقی رہ گیا تھا۔ شاردا ایکٹ کے ذریعہ منصب افتا بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر اسمبلی کے قبضے میں چلا گیا۔

فرمایئے۔ اس کے بعد (جبکہ قاضی بھی حکومت ہو گئی اور مفتی بھی) مسلمانوں کے ہاتھ پلے باقی کیا رہا؟ افسوس زیادہ تر اس کا نہیں کہ نکاح صغر سنی جائز ہو گیا بلکہ ماتم اور مرثیہ اس کا ہے کہ لے دے کر صرف منصب افتا مسلمانوں کے پاس محفوظ رہ گیا تھا وہ بھی ان کے قبضے سے نکل گیا۔ یہاں در حقیقت بکری کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ اصل ماتم اس کا ہے کہ ملک الموت نے گھر دیکھ لیا۔ شاردا ایکٹ کی اصولی خرابی یہ

ہے کہ خود ارباب مذہب اپنے مذہب میں آزادانہ رہے
اور مذہبی فتویٰ اس کے ہاتھ میں آگیا جو مذہب سے
بالکل آزاد ہے (۲)۔"

اس کے بعد مولانا نے بڑی تفصیل سے اس ایکٹ کی
جزوی و فروعی خرابیاں شمار کی ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے اس دور کے ایک اور اہم سیاسی مسئلے
نہرو رپورٹ پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"انڈین نیشنل کانگریس نے سب سے بڑی
غلطی یہ کی ہے کہ اس نے نہرو رپورٹ کو ایک سال
کے لیے قبول کر لیا------ گاندھی جی نے اس
رپورٹ کو کانگریس کے پلیٹ فارم ۱۹۲۸ء میں منظور
کرا کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا (۳)۔"

اس دور کا ایک اور اہم تر سوال یہ تھا کہ مسلمان کیا کریں۔
جدوجہد آزادی میں ان کا طرز عمل کیا ہو؟ ایک طرف ہندو تھا جو چاہے
کانگریس کا لبادہ اوڑھ کر آئے مگر ذہن و فکر کے اعتبار سے ہوتا ہے وہ
نرا ہندو کا ہندو اور مہا سبھائی۔ حریت پسند مسلمان برادران وطن میں
سے "ہندوستانیوں" کو تلاش کرکے لاتے تھے، مگر وقت آنے پر وہ ہندو

ثابت ہوتے تھے۔ مستقبل کے لیے ملک کے دستور اساسی کی ترتیب
و تدوین کا مرحلہ پیش آیا۔ وزیر ہند نے چیلنج کیا کہ اہل ہند تمام
طبقات اور فرقوں کا متفقہ دستور پیش کریں اور زیر لب یہ بھی کہہ دیا
کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔" یہ ایک نازک
موقعہ تھا۔ غیرت قومی اور حب وطن کا تقاضا تھا کہ ہر فرقہ وسعت
ظرف کا ثبوت دیتا۔ شبہات کو دل میں جگہ نہ دیتا اور مصالحانہ
جذبات کا مظاہرہ کرتا۔ خصوصاً اکثریتی فرقہ کا فرض تھا کہ وہ اپنے
فراخدلانہ طرز عمل سے اقلیتوں کو مطمئن کرکے ایک متفقہ و متحدہ
دستور کی تدوین و ترتیب میں حصہ لیتا۔ مگر مظاہرہ اس کے برعکس ہوا
اور "نہرو رپورٹ" کی شکل میں جو دستور مرتب کیا گیا وہ خصوصاً
مسلمانوں کے لیے کسی قیمت پر قابل قبول نہ تھا۔ چنانچہ یہ رپورٹ
بڑی "معرکہ آرا" ثابت ہوئی۔ خوب ہنگامے ہوئے اور بالآخر
کانگریس نے اپنے اجلاس لاہور میں اس کو "راوی برد" کر دینے کا فیصلہ
کیا۔

چنانچہ جدوجہد آزادی کا یہ لمحہ مسلم زعماء سیاست کے لیے
امتحانی لمحہ تھا۔ ایک طرف ہندو تھا۔ جس سے کسی طرح اشتراک
و تعاون کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف تھا انگریز جو ہمارا

بڑا دشمن تھا اور ہمارے ہر طرح کی عداوت و نفرت کا مستحق اور ہدف ۔
مسلم زعما، کا امتحان یہ تھا کہ وہ اس وقت جو فیصلہ کریں وہ متوازن
ہو، جذبات پر مبنی نہ ہو ۔ عقل و ہوش کی رہنمائی میں ہو، نہ تو حصول
آزادی کے ولولے کو جنون میں تبدیل ہونے دیں کہ حقوق کی بھی پروا
نہ رہے اور حفاظت حقوق کی لے اتنی بڑھائیں کہ اصل نصب العین
حصول آزادی، نظر انداز ہو جائے ۔

یہی فیصلہ مولانا نے فرمایا اور اسی راہ عمل کی دعوت انھوں
نے مسلمانوں کو دی ۔

"مسلمانوں کے لیے یہی راہ عمل ہو سکتی ہے کہ وہ بھی آزادی
کے لیے متفقہ طور پر میدان میں آئیں ۔"

مگر کانگریس میں شامل ہو کر نہیں، ہندوؤں کا ضمیمہ بن کر
نہیں، بلکہ جمعیۃ علمائے ہند برطانیہ کے خلاف جنگ کا جو پروگرام
تیار کرے اس پر عمل کریں ۔"

یعنی برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو نصب العین ہے،
اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے، مگر یہ جدوجہد گاندھی کی قیادت میں اور
کانگریس کے جھنڈے تلے نہیں بلکہ خود اپنی تنظیم اور جمعیت کی
نگرانی اور رہنمائی میں ۔

مگر اسی کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کا تحفظ اور اپنے حقوق
کے حصول سے بھی غفلت نہ ہونے پائے ۔

"الغرض حصول آزادی اور حفاظت حقوق دونوں کے لیے
مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے" ۔

آخر میں مولانا کے اس خطبہ کا وہ پیراگراف ملاحظہ فرمایئے جس
میں مولانا نے دین کو ایک نظام حیات ایک جامع و کامل نظام حیات
اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی مذہب کی حیثیت
سے پیش کیا ہے فرماتے ہیں ۔

"مذہب اسلام ایک مکمل مذہب ہے ۔ جو
زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے ۔ نہ تنہا سیاست بلکہ
عقائد و عبادات، تزکیہ نفس، اخلاق، معاملات،
اقتصادیات، اپنوں کے ساتھ رحم و رافت، غیروں
کے ساتھ حسن سلوک و رواداری، اقربا کے ساتھ
صلہ رحمی، اعدائے دین کے ساتھ حالات کے ماتحت
صلح، جہاد، خراج سب کچھ مذہب کے وسیع دامن میں آ
گیا ہے ۔ اس میں نہ صرف کتاب الایمان، کتاب الصلوۃ
پر اقتصار ہے، بلکہ کتاب البیع، کتاب الوکالت، کتاب

الدعویٰ وغیرہ بھی اس میں موجود ہیں جن کے احاطہ
سے زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے۔"

۱۹۳۰ء کے اس خطبہ کی مندرجہ بالا عبارت میں دین کی جامعیت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس کو پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ ۳۰ء میں مولانا مودودی کا کوئی مقالہ پیش نظر ہے۔

یہاں ہم یہ حقیقت بھی ضبط تحریر میں لے آنا چاہتے ہیں کہ مولانا کے اس خطبے کے بعض حصوں کو جمعیۃ العلما کے اکابر نے اپنی پالیسی کے خلاف سمجھ کر اور اپنے مقاصد کی راہ میں حائل ومانع دیکھ کر اشاعت کے وقت حذف کر دیا تھا۔ مثلاً خطبہ میں نہرو رپورٹ کی حمایت کے سلسلے میں گاندھی پر سخت تنقید کی گئی تھی، ہندو و مسلم اتحاد کے باب میں اس کے طرز عمل پر تبصرہ کیا گیا تھا اور حکومت سے متصادم ہو جانے کے بجائے آشرم میں پناہ گزین اور گوشہ گیر ہو جانے پر یہ شعر چسپاں کیا گیا تھا۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں
کنج گرفت و یاد خدا را بہانہ ساخت

یہ ایک تلخ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ جمعیۃ العلماء میں ابتداء ہر مسلک فکر و مکتب خیال کے علما شریک تھے۔ لیکن دیوبندی

مدرسہ فکر کے علما کی تنگ نظری کے باعث رفتہ رفتہ تمام علما کنارہ کش ہو گئے اور جمعیۃ العلماء صرف دیوبندی جمعیۃ العلماء بن کر رہ گئی اور ہم جیسے غیر دیوبندی نیاز مندان علمائے دیوبند کے لیے حسن ظن کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ۳۰ء تک جمعیۃ العلماء ایک مستقل سیاسی دینی جماعت تھی۔ جس کی اپنی رائے تھی، اپنی پالیسی تھی اور مستقل وجود تھا۔ لیکن بڑی سرعت سے جمعیۃ علمائے اس خشوع وخضوع کے ساتھ کانگریس کی حمایت واعانت اور ہم زبانی وہم خیالی اور "بتان نہرو بھون" کے انقیاد واتباع کا مظاہرہ کیا کہ آخر آخر میں جمعیۃ کو کانگریس سے تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور جمعیت کانگریس کا ایک شعبہ بن کر رہ گئی اور اس کے نتیجے میں علمائے دیوبند نے مسلم عوام کے قلوب سے اپنی محبت وعقیدت کھو دی اور اسلامیان ہند نے اپنی منزل مراد، قیام پاکستان ----- کی طرف اقدام کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت وسیادت قبول کرلی۔

بعد میں (مسلم لیگی قیادت کی کامیابی وقبول عام کو دیکھ کر چند غیر کانگریس علماء (۴) دیوبند اگرچہ آگے بڑھے تھے، اور ہم نے انھیں خوش آمدید کہا۔ لیکن اذا جاء نصر اللہ والفتح کے بعد ایک رواں

دواں اور منزل مقصود سے قریب تر کارواں میں آکر مل جانے والوں کو وہ حیثیت کیسے حاصل ہو سکتی تھی جو کارواں کو ترتیب دینے والے راستہ ڈھونڈ کر نکالنے والے اور منزل متعین کرنے والے رہنماؤں کو حاصل تھی۔ پھر یہ حضرات اس قدر تاخیر(۵) سے کارواں ملت میں آکر شریک ہوئے کہ مسلم عوام و خواص علماء دیو بند کے ہر گروہ سے یک گونہ بیزار و برہم و بدظن ہو چکے تھے۔ اس لیے ان آنے والوں کی پذیرائی ضرور کی گئی مگر نہ عام مسلمانوں نے ان کی آمد و شرکت کو غیر واقعی اہمیت دی نہ قیادت عظمیٰ کو اب ان کی حمایت و نصرت واعانت کی ضرورت واحتجاج باقی رہی تھی۔

ملک کے مسلمانوں کی حمایت و وکالت کی گھڑی وہ تھی جب جواہر لال نہرو نے دعویٰ کیا تھا کہ ملک میں صرف دو طاقتیں ہیں کانگریس اور انگریز۔ جواہر لال کے اس ادعائے باطل کے ابطال وتغلیط کے لیے جو مرد مجاہد سینہ سپر ہو کر میدان میں ڈٹ گیا تھا۔ ہم نے اسے قائد اعظم بنایا اور جو مدعیان قیادت و رہبری اس وقت مہر بلب رہ گئے وہ مقام محبوبیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ چاہیے وہ کتنے ہی بڑے محدث کیسے ہی متدین ایثار پیشہ بلند کردار اور ملک سیرت کیوں نہ ہوں۔

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

بڑے ہی نیک طینت پاک اندروں، سادہ مزاج اور عزیمت شعار بزرگ تھے۔ ساری زندگی حدیث نبوی کے درس میں گذری۔ جہاد آزادی میں قید و بند کے جو شدائد و آلام ان کو ارزانی ہوئے تھے وہ اچھے اچھوں کے لیے وجہ غبط ہو سکتے ہیں۔ شخصی طور پر وہ بہت سے محامد و محاسن اخلاق کے حامل تھے، اور بعض صفات حسنہ مثلاً عجز وتذلل میں وہ اپنے بیشتر معاصرین میں ممتاز تر تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارے قلب میں مولانا مرحوم کی شخصیت کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات کی افراط ہے مگر کسی بھی شخصیت کے سیاسی یا علمی نظریات سے اختلاف کو نہ ہم احترام و عقیدت کے منافی سمجھتے ہیں اور نہ اس اختلاف کے اظہار میں اس لیے تامل و تکلف کو ہم جائز سمجھتے ہیں کہ ایک جماعت ایک گروہ ایک طبقہ اس شخصیت کا پرستار و جاں دادہ ہے بلکہ جو شخصیت جتنی عظیم ہوتی ہے اور اس کا دائرہ عقیدت و ارادت جس قدر وسیع ہوتا ہے اور اس کے افکار و نظریات کے ابطال و تردید کی بھی ضرورت اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی قوت

فیصلہ کے متعلق ہم اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انہوں نے مدت العمر کسی بھی سیاسی مسئلے میں اصابت رائے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کا انداز فکر منطقی نہیں جذباتی تھا۔ انگریز کی دشمنی میں وہ حدود اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے اور استخلاص وطن کے لیے وہ ہندو قوم سے غیر مشروط اتحاد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ اشتراک وطن کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک قوم فرمانے لگے تھے۔ "وطنی قومیت متحدہ" کی تبلیغ کو انہوں نے اپنے مشن کا ایک جز بنا لیا تھا اور شہر شہر اس کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ زبان وقلم کا پورا زور اس متحدہ قومیت کی حمایت میں صرف فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار دہلی میں انہوں یہ گمراہ کن اور نہایت غلط بات بڑے زور کے ساتھ فرمائی کہ

"اقوام اوطان سے بنتی ہیں"

خدا بھلا کرے، مرد قلندر کا۔ اس نے دیوبند کے شیخ الحدیث کی زبان سے جو یہ بات سنی تو تڑپ گیا اور چیخ اٹھا۔

زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است!

حال آنکہ زندگی بھر علامہ نے کبھی شخصیات کو اس طرح رد وقدح کے لیے موضوع ذکر وخطاب نہیں بنایا تھا۔ مگر اس سے پہلے

کسی نے اتنی بڑی غلط بات بھی تو نہیں کہی تھی۔ علامہ اقبال کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا مدنی کے اس گمراہ کن نظریہ پر اپنے ایک سلسلہ مضامین میں بھرپور اور مدلل تنقید(۲) کی اور اس طرح ان دو بزرگوں کی برمحل رہنمائی سے اسلامیان ہند ایک بہت بڑے فتنے سے محفوظ رہے ورنہ خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا اور برصغیر میں ایک آزاد مسلم حکومت کے قیام کے بجائے ہم شاستریوں اور اندراؤں کے رحم وکرم پر ہوتے اور ایک وطنی قومیت میں کب کے ضم ہو چکے ہوتے۔ اور ہم میں سے کتنی کثیر تعداد کے نام عبدالمجید خواجہ کے بجائے انند موہن خواجہ ہوتے۔ ہم شریمان ہوتے اور ہماری بیویاں شریمتی۔ زندگی بھر بندے ماترم کے جے کارے لگاتے اور مرتے تو ترنگے کفن میں ملفوف ہو کر۔

علمائے دیوبند میں سے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی کردار کو ہم نے اس لیے موضوع گفتگو بنایا کہ جمعیۃ العلماء کی صدارت سب سے طویل عرصہ تک مولانا ہی نے فرمائی تھی اور ۴۰ء کے بعد سے تو وہ اپنی وفات تک مستقلاً وبلا انقطاع صدر جمعیۃ رہے۔ اس لیے جمعیۃ کی پالیسی کی تبدیلی میں ان کا سب سے زیادہ دخل تھا اور یہ مولانا مرحوم کا کارنامہ تھا کہ رفتہ رفتہ جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں

میں اس قدر نامقبول بلکہ بالفاظ صحیح تر مغضوب ہوگئی تھی کہ ۴۶ء کے معرکہ آرا اور فیصلہ کن انتخابات میں خاص سہارنپور کی سیٹ سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نمائندہ کامیاب نہ ہو سکا اور شہید ملت خان لیاقت علی خان نے اپنے قوم پرست حریف کو اس کے مرکز میں عبرناک شکست دی۔

حد یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اور مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کے باوجود آج بھی جمیعۃ بھارت کے عوام وخواص کی قیادت کی اہل نہیں مانی جاتی۔

حواشی:

(۱) مطبوعہ نادر برقی پریس بلیماراں دہلی

(۲) خطبہ صدارت اجلاس سالانہ جمیعۃ العلماء منعقدہ امروہہ مئی ۱۹۳۰ء، نادر برقی پریس دہلی

(۳) خطبہ صدارت صفحہ ۲۴

(۴) مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم وغیرہ

(۵) لطیفہ تو علماء دیوبند کے ایک تیسرے گروہ سے سرزد ہوا، ہماری مراد مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے گروہ سے ہے۔ مولانا جہاد آزادی کے سارے معرکے میں ساکت وصامت اور بے تعلق رہے اگر کبھی گویا بھی

ہوئے تو فرنگی کی حمایت میں اور آزادی پسندوں کے خلاف بولے مگر قیام پاکستان کے بعد اب ایک کتاب لکھی گئی ہے اور لطائف وظرائف کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور دراصل وہی بانی پاکستان ہیں۔

(۶) اور اس تنقید کی سزا مولانا مودودی کو یہ دی گئی کہ دیوبند کے مفتی اعظم نے اپنا قلمدان طلب فرمالیا اور ایک فتوے تکفیر وتفسیق داغ دیا۔ مفتی اعظم مولوی کفایت اللہ صاحب نے بھی اس لے میں لے ملائی اور خود مولانا حسین احمد مدنی نے مولانا مودودی کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر رسائل ومضامین کا ایک سلسلہ تحریر فرمادیا۔ دیوبند میں ایک ادارہ ردمودودیت قائم کیا گیا۔

حج بیت اللہ

مولانا کے دل میں ادا فریضہ حج کی تڑپ تو مدتوں سے تھی۔ جس کا اظہار مختلف مواقع پر حسرت بھری گفتگو اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ہوتا رہتا تھا۔ مگر اس مرد قلندر کے پاس اس سفر کے سرد برگ فراہم ہونے کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ جس کی قلیل آمدنی کا بقدر ربع حصہ اس کے عیال واہل پر خرچ ہوتا تھا اور باقی طلبہ کی خدمت میں صرف ہو جاتا تھا۔

مگر ۳۵ء میں دیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور بیت اللہ کے حج کی دیرینہ آرزو پوری ہو ہی گئی۔

صورت یہ ہوئی کہ مولانا کے چھوٹے بھائی (۱) شفاء الملک حکیم مولوی نظام الدین صاحب مدظلہ نے مولانا سے اپنے عزم سفرِ حج کا اظہار کیا۔ حکیم صاحب قبلہ ایک نامور مقبول معالج ہیں۔ اطراف وجوانب کے بیشتر رؤسا اور والیان ریاست کے مشیر طبی ہیں، آپ کے فاضل وسعید صاحبزادہ مولوی حکیم نصیر الدین ندوی مطب اور نظامی داوخانہ کی نگرانی میں آپ کے رفیق ومعاون ہیں۔ گویا وہ اب اللہ کے فضل وکرم سے اس موقف میں ہیں کہ راہ شوق میں گام فرسائی کر سکیں۔ مولانا کو چھوٹے بھائی کے عزم سفر کی اطلاع ہوئی تو ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی اور ساز وبرگ سفر کی فکر سے بے پروا ہو کر خود بھی عزم سفر کیا۔ خدا نے زادِ راہ (۲) بھی فراہم فرما دیا اور مولانا والہانہ حج وعج کے ساتھ اس عاشقانہ سفر پر روانہ ہوئے۔

میرے سامنے مولانا کی ایک ڈائری ہے، جو مولانا سفرِ حج کے دوران لکھتے رہے۔ یہ غالباً یادداشتیں ہیں اور سفرنامے کے لیے مختصر سے اشارے۔

اس سال برصغیر کے جن اکابر ومشاہیر وعلماء وروسا نے حج

وزیارت کی سعادت حاصل کی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولوی عبدالقدیر بدایونی (مفتی اعظم حیدرآباد دکن)، مولوی محمد طیب مہتمم مدرسہ دیوبند، مولوی محمد نعیم لدھیانوی، مولوی عبدالقیوم سندھی، مولوی مظہر الدین ایڈیٹر الامان دہلی، مولوی شاہ نظام الدین پھلواری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا حسرت موہانی، اہلیہ نظام دکن، والدہ نظام دکن، نواب صاحب بہاولپور، امان اللہ خان، سابق امیر افغانستان، نواب مزمل اللہ خاں بھیکم پور، سر نظامت جنگ بہادر۔

اب میں مولانا کا (۳) روزنامچہ نقل کرتا ہوں۔

تاریخ روانگی از اجمیر برائے حج ۵ ذی قعدہ ۱۹۵۳ھ م ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء، بروز یکشنبہ

۶/۱۱/۵۳ھ، ۱۱/۲/۳۵ء	ورود بمبئی وقیام در خلافت ہاؤس
۹/۱۱/۵۳ھ، ۱۱/۲/۳۵ء	روانگی از بمبئی
۱۰،۱۱/۱۱/۵۳ھ، ۱۶/۲/۳۵ء	قفس جہاز
۱۲/۱۱/۵۳ھ، ۱۷/۲/۳۵ء	ورود ساحل کراچی (۴) (۳ بجے صبح)
۱۳/۱۱/۵۳ھ، ۱۸/۲/۳۵ء	یوم رحیل از ساحل کراچی (۶ بجے شام)

۱۴/۱۱/۵۳ھ، ۱۹/۲/۳۵ء — قفس جہاز، ٹی پارٹی سر نظامت (۵)
جنگ بوقت عصر

۱۵/۱۱/۵۳ھ، ۲۰ تا ۲۴/۲/۳۵ء — قفس جہاز

۲۰/۱۱/۵۳ھ، ۲۵/۲/۳۵ء — صبح تقریباً ۸ بجے جہاز کامران میں
لنگر انداز ہوا اور ۱۰ بجے روانہ ہوا

۲۱/۱۱/۵۳ھ، ۲۶/۲/۳۵ء — قفس جہاز، یوم الاحرام بطلوع یلملم
(میقات) (۶ بجے شام)

۲۲/۱۱/۵۳ھ، ۲۷/۲/۳۵ء — یوم بلوغ بندرگاہ جدہ (۹ بجے صبح)

۲۳/۱۱/۵۳ھ، ۲۸/۲/۳۵ء — سفر بذریعہ موٹر از جدہ تا مکہ مکرمہ

۲۴/۱۱/۵۳ھ، ۱/۳/۳۵ء — یوم الجمعہ، ورود مکہ مکرمہ (۹ بجے صبح)
طواف عمرہ، سعی و نماز جمعہ
دعا للوالدین والاساتذہ

۲۵/۱۱/۵۳ھ، ۲/۳/۳۵ء — دعا تحت المیزاب لجمیع الاحباب
والاعزہ و معائنہ مدرسہ صولتیہ

۲۶/۱۱/۵۳ھ، ۳/۳/۳۵ء — زیارت جنت المعلیٰ، دعوت طعام

۲۷/۱۱/۵۳ھ، ۴/۳/۳۵ء — زیارت مسجد قبیس

۲/۱۲/۵۳ھ، ۸/۳/۳۵ء — دعا عند الملتزم لعبد الباقی (۹) سلمہ
ربہ

۳/۱۲/۵۳ھ، ۱۰/۳/۳۵ء — شرکت جلسہ، مدرسہ فخریہ عثمانیہ
ورود امان اللہ خان (سابق شاہ
کابل) اور ورود ابن مسعود

۵/۱۲/۵۳ھ، ۱۱/۳/۳۵ء — زیارت غار حرا

۶/۱۲/۵۳ھ، ۱۲/۳/۳۵ء — اعلان رویت ہلال، احرام کعبہ

۷/۱۲/۵۳ھ، ۱۳/۳/۳۵ء — (وزارت حکومت حجازیہ) ۸ ذی الحجہ
یوم الترویہ والرحیل الی المنیٰ،
غسل احرام، روانگی (۷ بجے صبح)
رسیدن فقیر تا منیٰ پاپیادہ، صلوٰۃ عصر
مسجد خیف وغیرہ

۹/۱۲/۵۳ھ، ۱۴/۳/۳۵ء — یوم الخمیس، روانگی از منیٰ ۸ بجے صبح
بطلوع عرفات (۱۱ بجے) یوم الوقوف
دعا، تجمیع، روانگی بعد غروب
رسیدن مزدلفہ قریب نصف لیل

۱۰/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۱۵/ ۳/ ۳۵ء	یوم الجمعہ، یوم النحر، از مزدلفہ تا منیٰ پا پیادہ منظر عجیب رمی الجمار - سفاہت حکومت نجدیہ، منظر مسخر حملہ بر ابن مسعود، واقعہ قتل درحرم، جیس، برادر وزیر جنگ یمنی
۱۱/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۱۶/ ۳/ ۳۵ء	علی الصباح طواف زیارہ معی السعی
۱۲/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۱۷/ ۳/ ۳۵ء	یوم النفر، انتظام سید عقیل معلم وعرصہ محشر دروی ثبوت بے چارگی فقیر، روانگی حجاج و جمیع رفقا وتنہائی فقیر ظہور رحمت الٰہی بصورت اختر قیام بمسجد خیف
۱۳/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۱۸/ ۳/ ۳۵ء	یوم النفر الاخر بوقت صباح زیارت مقامات ذیل: (الف) موضع نزول سورۃ والمرسلات (ب) مسجد انا اعطینک الکوثر (ج) مذبح حضرت اسمٰعیل

	علیہ السلام - رمی آخر تم الحج بحمد اللہ سبحانہ روانگی از منیٰ بسوئے مکہ نزول المحصب (۷) ونماز ظہر وعصر دراں ورود مکہ مکرمہ قبل مغرب زیارت مسجد جن دراثنائے راہ
۱۵/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۱/ ۳/ ۳۵ء	الرحلۃ من المکۃ المکرمۃ بعد العصر بعد طواف الوداع (وادیلاہ من فرقہ مکۃ المکرمۃ) بلوغ جدہ ثلث اللیل تقریباً
۱۶/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۱۱/ ۳/ ۳۵ء	روانگی از جدہ بسوئے مدینہ طیبہ (۸ بجے صبح)
۱۷/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۱/ ۳/ ۳۵ء	یوم جمعہ، یوم حاضری مدینہ طیبہ عندالعصر حاضری حرم عندالعشا، دعا لعزیز المنتخب (۸) سلمہ ربہ - اقیام دراحاطہ، ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ قریب الحرم النبوی
۱۸/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۳/ ۳/ ۳۵ء	تشرفت بزیارۃ جنۃ البقیع التی فیہا

الازواج المطہرات وعثمان بن
عفان وعباس بن عبدالمطلب
وبنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
زینب ورقیہ وام کلثوم وفاطمہ
والحسن وزین العابدین وابوسعید
الخدری ومالک الامام واستاذہ، نافع
(مولی بن عمر) وغیرہم من
المہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم

۱۹/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۲/ ۳/ ۳۵ء — دعوت مولانا عبدالباقی فرنگی محلی،
گفتگوئے خاص معائنہ مدرسہ علوم
شرعیہ وملاقات مولوی سید احمد
صاحب فیض آبادی ۔ ملاقات
مولوی محمد بخاری تلمیذ فقیر۔

۲۰/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۵/ ۳/ ۳۵ء — سپردن رسالہ وفتوی بہ عزیز
مولوی رشید احمد صاحب کیرانوی
تلمیذ فقیر در مدرسہ، علوم شرعیہ
مدینہ منورہ

۲۱/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۶/ ۳/ ۳۵ء — زیارت مقامات ذیل (الف) مسجد
قبا، (ب) مسجد ذو قبلتین، (ج)
جبل احد وزیارت سیدنا حمزہ رضی
اللہ عنہ وجمیع شہدائے احد رضی
اللہ عنہم ۔ صلوۃ تطوع در ہر دو مسجد
درس اربعین نووی فی الحرم النبوی
بہ مولوی نصیر الدین ساکن باسنی

۲۲/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۷/ ۳/ ۳۵ء — غسل در حمام مدینہ طیبہ، درس
اربعین نووی فی الحرم النبوی،
زیارت بیرحاء شرب مائہ یعلمہ
الخواص من الناس۔

۲۳/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۸/ ۳/ ۳۵ء — درس اربعین نووی فی الحرم النبوی

۲۴/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۲۹/ ۳/ ۳۵ء — درس اربعین نووی فی الحرم النبوی
(ختم)

۲۵/ ۱۲/ ۵۳ھ، ۳۰/ ۳/ ۳۵ء — زیارت بیر بضاعہ لیستقی منہا الماء
بجلین وحمار فیہا ثلاثۃ ۔ اغرب

۲۶/۱۲/۵۳ھ، ۳۱/۳/۳۵ء — یوم الرحیل بعد الظہر - صلوۃ وسلام کے بعد حرم نبوی سے رخصت حاصل ہوئی - حین العصر روانگی ہوئی (وامصیبتاہ من فرقۃ الحرم النبوی)

۲۷/۱۲/۵۳ھ، ۱/۴/۳۵ء — بلوغ بندگاہ جدہ حین العصر (۵ بجے تقریباً)

۱/۱/۵۴ھ، ۵/۴/۳۵ء — یوم الجمعہ، روانگی از جدہ بوقت (۶ بجے صبح) تقریباً در جہاز رحمانی، بوقت (۷ بجے صبح) جس کروند وبوقت (چار بجے) شام روانہ شد (واحسرتاہ من فرقۃ ارض القرآن العرب)

۴/۱/۵۴ھ، ۸/۴/۳۵ء — قفس جہاز، درخواست حجاج بابت رفتار جہاز

۵/۱/۵۴ھ، ۹/۴/۳۵ء — قفس جہاز، بلوغ بہ عدن ۹ (بجے صبح روانگی از عدن (۱ بجے ۹ حین الظہر

۷/۱/۵۴ھ، ۱۱/۴/۳۵ء — قد فسد الہواء فی ہذا القفس العفن مات رجلان فی ہذا الیوم لفساد الہوا وایضاً ماتت امراۃ بعد الظہر

۹/۱/۵۴ھ، ۱۳/۴/۳۵ء — بعد العشاء تقریر فقیر متعلق شہادت بعد درخواست اہل جہاز

۱۲/۱/۵۴ھ، ۱۶/۴/۳۵ء — قفس جہاز تقریباً ۷ بجے صبح ساحل کراچی پر جہاز لنگر انداز ہوا - برادر عزیز حکیم نظام الدین وحافظ عبدالرحمن وجواں بخش نصیر آبادی یہاں سے علحدہ ہوگئے - بوقت ۴ بجے شام جہاز روانہ ہوگیا -

۱۴/۱/۵۴ھ، ۱۸/۴/۳۵ء — یوم ورود بمبئی تقریباً ۱۲ بجے - بعد معائنہ ڈاکٹر ساحل پر جہاز آگیا - الحمد للہ علی ذلک

۱۵/۱/۵۴ھ، ۱۹/۴/۳۵ء — آج شب بمبئی سے روانگی ہوگئی

۱۶/۱/۵۴ھ، ۲۰/۴/۳۵ء — علی الصباح ورود احمد آباد بوقت ۳ بجے شام احمد آباد سے بجانب اجمیر

شریف روانگی (آخر مرحلہ سفر)

۱۶/۱/۱۴۰۳ھ ، ۲۱/۳/۸۵ء علی الصباح اجمیر شریف ورود ہو گیا تم السفر بحول اللہ وقوتہ الحمد للہ علی ذلک

اب اس سفرنامے کے وہ اجزاء نقل کئے جاتے ہیں۔ جن کا تعلق واردات و مکشوفات سے ہے۔ اس مقدس سفر کے دوران مولانا پر حج اور اس کے مختلف اعمال و مناسک کے جو اسرار و حکم منکشف ہوتے تھے۔ ان کی یادداشتیں تحریر فرمائی تھیں۔ آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ پورا سفرنامہ ہی دراصل مجوزہ سفرنامے کے لیے اشارات اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ان واردات حرمین کی نوعیت بھی دراصل عنوانات کی ہے۔ جن کو غالباً مفصلاً و مشرحاً تحریر فرمانے کا خیال ہوگا۔ مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ بہرحال ان عبادات کو جو تمام تر عربی میں ہیں، یہاں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

قد القی فی روعی حکمۃ رمی الجمار قد القی فی روعی حکمۃ من حکم الحج من کسر

غرور النفس

مجھے کنکریاں پھینکنے کا فلسفہ سمجھایا گیا حج کی بہت سی حکمتوں میں ایک یہ حکمت سمجھ میں آئی کہ اس سے انسان کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔

قد القی فی روعی الیوم سر من اسرار الحج من المشقۃ والمحنۃ وقدر نعم اللہ تعالی المبذ ولۃ فی الوطن

آج حج کے رازوں میں سے ایک یہ راز سمجھ میں آیا کہ اس میں جو مشقت و محنت اٹھانی پڑتی ہے، اس سے اللہ تعالی کی ان نعمتوں کی قدر آجاتی ہے جو وطن میں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔

قد القی فی روعی دفع الشبہۃ المتعلقۃ باستلام الحجر الاسود وان احترامہ بالتعیین لا لغیر

حجر اسود کو بوسہ دینے پر جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب ذہن میں آیا اور یہ بات سمجھ میں آئی کہ صرف حجر اسود کا احترام کیوں ہے؟

قد انکشفت الیوم خصوصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی امر الزیارۃ

وعدم تعيين اليوم

آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امارت کی خصوصیت اور دن کے معین نہ کرنے کی مصلحت سمجھ میں آئی۔

قد القی فی ردعی ان الحج معیار یظہر ماخفی من الناس مزالا خلاق والعدات والنیات

یہ بات دل میں ڈالی گئی کہ حج ایک ایسا معیار ہے جس سے (رفقاء سفر پر) انسان کے وہ خصائل وعادات اور ارادے آشکار ہو جاتے ہیں جو اب تک علم میں نہیں تھے۔

قد القی فی ردعی ان الحج لیس لہ نظیر فی المجامع

مجھے یہ بات سمجھائی گئی کہ اجتماعات میں اجتماع حج اپنی مثال آپ ہے۔

قد رائیت بعین البصیرة معنی قول النبی صلی الله علیه وسلم ورائیت الجنة واکھر اھلھا الضعفاء فانھم کما یصلون ویصومون

ویقرون القران ویتعلون السنة تحجون ایضاً ولامراء مغمور فیھم کالملح فی الطعام

میں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب بچشم بصیرت دیکھا۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "میں نے جنت کو دیکھا کہ اس میں ضعفا (غریبوں) کی کثرت ہے" واقعہ یہ ہے کہ غریب جس طرح نماز پڑھتے، روزہ رکھتے اور قرآن وسنت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس طرح حج بھی (کثیر تعداد میں وہی) کرتے ہیں اور امرا کی تعداد (ان حجاج) میں آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔

قد القی فی ردعی الیوم ان الوقوف فی العرفة کالوقوف فی عرصة المحشر

آج مجھے یہ بات سمجھائی گئی کہ عرفہ میں وقوف بالکل ایسا ہی ہے جیسے میدان حشر میں وقوف۔

قد القی فر ردعی الیوم ان

في سفر الحج الكمالات تاثير في ازالة الكسل من اكمالات والخيرات

آج مجھے یہ بات سمجھا گئی کہ سفر حج اس کسل کو دور کرتا ہے جو کمالات اور نیکیوں میں حارج ہوتا ہے۔

قد القي في ردعي من خوق الاسباب من ازالة المرض اولمساک تاثيره ايضاً من الايات البينات كما زال مرض الفقير وامسك تاثيره

میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ مرض کا کلیتاً زائل ہو جانا یا اس کے اثرات اور اس جیسے امور جو اسباب کے برخلاف ظاہر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نشانیوں میں سے ہیں۔ جیسے خود خاکسار کا مرض بالکل جاتا رہا۔

قد القي في ردعي ان تذكار الاكابر على قدر مراتبهم ايضاً من العبادات پر شبدک اليه مناسک الحج

میرے دل میں یہ بات آئی کہ اکابر دین کا علی قدر مراتب ذکر خیر بھی ایک نوع کی عبادت ہے۔

حواشی:

(۱) ولادت ۱۳۰۰ھ

(۲) کل ۳۹۰۹ روپے خرچ ہوئے تھے اور مولانا نے عرشہ پر سفر کیا تھا۔

(۳) مصارف کی تفاصیل چھوڑ دی ہیں "واردات بھی چھوڑ دیئے ہیں وہ روزنامچے کے بعد نقل ہوں گے۔

(۴) یہاں پیر محمد ہاشم مجددی اور دوسرے متعدد حضرات اپنے اساتذہ مولانا مرحوم اور حکیم صاحب مدظلہ کی دست بوسی و حصول نیاز کے لیے تشریف لے آئے تھے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ ہم مولانا کو اعلیٰ درجات میں تلاش کرتے رہے مگر مولانا عرشہ پر سفر کر رہے تھے۔

(۵) انہی سر نظامت جنگ سے تعارف وشناسائی کا واقعہ اور لطیفہ مولانا عبدالشاہد خان شروانی نے باغی ہندوستان میں لکھا ہے کہ پہلے ان سے مولانا کا تعارف ایک عالم دین کی حیثیت سے ہوا۔ تو انہوں نے اعتنا نہیں کیا مگر دوسرے روز جب انہیں معلوم ہوا کہ مولانا کو اجمیر سے نسبت ہے تو بڑی عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ اس پر مولانا کو جلال آگیا اور فرمایا کہ علم دین کی آپ کے یہاں کوئی وقعت نہیں۔ اجمیر سے نسبت کی اہمیت ہے۔ حالانکہ اجمیر میں تو فساق اور کفار بھی رہتے ہیں۔ اس پر رئیس موصوف بڑے خجل ہوئے۔

(۶) مولانا عبدالباقی مدظلہ، مولانا کے فرزند وحید وسعید ورشید اپنے والد ماجد علیہ الرحمۃ اور دوسرے اساتذہ وقت سے درسیات فنون کی تکمیل کرکے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر سے سند فراغ وتکمیل حاصل کی۔ الہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی دیئے۔ تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے آئے اور یہاں مہاجرت کے تمام لوازم وثمرات سے من کل الوجوہ "متمتع" ہو رہے ہیں۔

مولانا عبدالباقی پہ اپنے والد ماجد کی تصویر ہوائی ہیں۔ بہت سی صفات اور بہت سی اداؤں میں اپنے عظیم المرتبت باپ سے مشابہ و مماثل ہیں۔ درویش خو پاک اندروں، سادہ مزاج، فقیر طینت، عالی حوصلہ، خوش خلق دار، عیال دست اور صبر و شکر کا ساتھی پیکر۔

(۷) (مسجد اجابت)

(۸) علامہ سید منتخب الحق قادری مدظلہ، صدر شعبہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی

اسعاف

اہل اللہ کے مزارات، درگاہوں اور خانقاہوں کے لیے موقوفہ جاگیروں کے نظم و تولیت میں عرصہ سے سوالات اٹھ رہے تھے۔ اجمیر میں خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کی موقوفہ جائداد اور اس کی تولیت کا مسئلہ ہنگامہ آرا بنا ہوا تھا اور ایک طبقہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک فتوے کے ایک جملے کے من مانے معنی مراد لے رہا تھا۔ اس لیے بار بار بکثرت اجمیر و بیرون اجمیر سے استفتا موصول ہوتے تھے اور مولانا حسب ضرورت بالاختصار جوابات تحریر فرماتے تھے۔ اس زمانے میں وقف بل کا غلغلہ بھی بلند ہوا تھا۔ اس لیے مولانا نے ایک جامع استفتا مرتب کرکے اس کا مفصل و مکمل و مدلل

جواب تحریر فرمایا اور پھر علمائے رام پور، علی گڑھ، پٹنہ، کانپور، لکھنؤ، پھلواری شریف، شاہجہانپور، حیدرآباد، کلکتہ، مولمین (برما)، لاہور، گولڑہ، دہلی اور دیوبند سے اس کی تصویب و توثیق کروائی اور اس کے بعد سفرِ حج کے موقع پر یہ فتویٰ اپنے ساتھ دیارِ عرب لے گئے، اور وہاں کے علمائے اعلام سے اس کو موثق کروایا اور مراجعت وطن پر ایک رسالہ کی شکل میں ۳۵ء میں اس کو شائع فرمایا(۱)۔

علمائے موئیدین و مصدقین میں سے حسب ذیل حضرات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حیدر حسن خاں شیخ الحدیث، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مولانا شاہ محی الدین قادری پھلواری شریف، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا مشتاق احمد کانپوری، مولانا فضل حق رام پوری، پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف، مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی۔

علمائے حجاز و نجد میں سے قاضی القضاۃ حکومت سعودیہ مولانا عبداللہ حسن، مولانا محی الدین بخاری (مکہ مکرمہ)، مولانا عیسیٰ رواسی (مکہ مکرمہ)، مولانا محمد حسن السندی (مکہ مکرمہ)، مولانا سالم بن سعید

عبداللہ العلوی (مکہ مکرمہ)، مولانا عفت اللہ (مکہ مکرمہ)، مولانا مخدوم مختار بن عثمان (مکہ مکرمہ)، مولانا سالم شفی (مکہ مکرمہ)، مولانا سید احمد (مدینہ منورہ)، مولانا فیروز احمد (مدینہ منورہ)، مولانا رشید احمد (مدینہ منورہ)، مولانا محمد سلطان (مدینہ منورہ) نے توثیق و تائید فرمائی۔

حاشیہ:

(۱) مطبوعہ خواجہ برقی پریس دہلی ۱۹۳۵ء

رسالہ حدوث دہری

مسئلہ زمان و دہر، طبعیات و علم الٰہی کے مہمات مسائل میں سے ہے۔ چنانچہ فلاسفہ یونان نے بھی اس موضوع پر فکر آرائیاں کی ہیں اور فلاسفہ فرنگ نے بھی، مسلم فلاسفہ میں سے ابو نصر فارابی، ابن سینا، ابن رشد، میر باقر داماد، محقق طوسی، متکلمین میں سے محقق دوانی، فخر رازی اور ابو حامد غزالی، ابو البرکات بغدادی وغیرہ نے اس مبحث پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ برصغیر کے فلاسفہ و متکلمین، ملا محمود جونپوری، ملا امان اللہ بنارسی، بحر العلوم عبد العلی، ملا کمال الدین سہالوی، امام فضل حق، علامہ عبد الحق خیر آبادی وغیرہ نے بھی اس

سے کما حقہ اعتنا کیا مگر خاتم المتکلمین مولانا حکیم سید برکات احمدؒ نے جس زور، جس شان اور جس تفصیل سے اس مبحث پر کلام کیا ہے وہ شاید تاریخ فلسفہ میں اپنی مثیل و نظیر آپ ہی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے جب حکیم صاحب کا رسالہ "اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" سبقاً سبقاً پڑھا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ:

> "ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔(۱)"

حکیم صاحب کے بعد مولانا معین الدین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور حدوث دہر پر ایک محققانہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اس دور کی علمی زبان عربی میں تھا۔ مولانا نے یہ مقالہ اپنے دور کی علمی زبان اردو میں تحریر فرمایا۔ اس مقالہ کی یہ بھی ایک اہم اور قابل ذکر خصوصیت ہے۔

اس مقالہ کے سلسلے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے حکیم صاحب کا رسالہ اگرچہ (جیسا کہ انہوں نے خود تحریر فرمایا (۲) ہے) سبقاً سبقاً پڑھا تھا، مگر یہ رسالہ فلسفہ قدیم کے فضلا

اور فلسفہ جدید سے بالواسطہ آشنا حضرات کے لیے قابل فہم و ہضم نہ تھا۔ اس لیے غالباً علامہ اقبال اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکے اور اس دور کے نامور خلافتی رہنما میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی نشاندہی پر انہوں نے مولانا معین الدین سے رجوع فرمایا۔ اور مولانا کے جواب سے مطمئن ہو کر انہیں شکریہ کا خط (۳) لکھا تھا۔

علامہ کے اس ذوق کو دیکھ کر شاید مولانا نے محسوس فرمایا ہو کہ قدیم مدارس کے باہر بھی نئے ماحول میں ان مسائل سے دلچسپی لی جاتی ہے اور مغربی علوم کے فضلا بھی اپنے اسلاف کی ذہنی کاوشوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عربی کے بجائے اردو میں بھی فلسفے کے ان مسائل پر قلم کاری کی ابتدا کی تھی۔

مولانا کا یہ مقالہ (۴) ایران کے مشہور فلسفی میر باقر داماد (ف ۱۰۴۰ھ) کے مخترعہ نظریہ حدوث دہری پر ایک تنقیدی جائزہ ہے۔ جس میں اس نظریہ پر متاخرین حکمائے ہند کی تنقیدات کو جو مطبوعات و مخطوطات میں منتشر تھیں، یک جا پیش کر کے اس نظریہ کا ابطال کیا گیا ہے۔ خصوصاً علماء فرنگی محلی و خیر آباد نے اپنے متون و شروح و حواشی میں اس نظریہ سے ابطال و تغلیط کا جو معاملہ کیا اس کی مفصل روداد اس مقالہ میں پیش کی گئی ہے۔

باری تعالیٰ عالم اور زمان کے متعلق تمام متقدمین و متاخرین فلاسفہ کا یہ متفقہ نظریہ ہے کہ:

۱.... باری تعالیٰ قدیم بالذات بھی ہے اور قدیم بالزمان بھی

۲.... عالم حادث بالذات مگر قدیم بالزمان ہے

۳.... زمان، حادث بالذات مگر قدیم بالزمان ہے

اس طرح عالم و زمان کو باری تعالیٰ کے ساتھ قدم ذاتی (۵) میں اختلاف کے باوصف قدم زمانی میں جو اشتراک ہے وہ میر باقر داماد کی نظر میں اشتراک نہیں، شرک قرار پایا۔ چنانچہ اس شرک سے محفوظ رہنے کے لیے انہوں نے عالم کو ذاتی طور پر بھی (جیسا کہ سب حکما کا قول ہے) حادث تو کہا ہی مگر زمانی طور پر بھی (تمام حکما کے برخلاف) حادث ہی قرار دیا۔ عالم کے ساتھ ساتھ زمان کے بھی حدوث ذاتی و حدوث زمانی کا دعویٰ کیا اور اس سے بھی بڑھ کر عالم و زمان دونوں کو حادث دہری قرار دیا۔ جب زمان خود حادث دہری ہو گیا تو جس قدر حوادث زمان میں واقع ہوں گے اور ہیں وہ سب بھی حوادث دہری ہو گئے۔

لطف یہ ہے کہ اگرچہ متکلمین کے نزدیک تو زمان و دہر میں مفہوم اور حیثیت کے فرق کے باوجود احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر حکمائے مشائیہ (جن کے خود جناب میر معتقد و مقلد اور ہم زبان

وہم خیال ہیں)، کے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے۔ مثلاً زمان میں امتداد ہے دہر میں نہیں۔ زمان تجدد وتعاقب کا حامل ہے دہر میں ممکن نہیں۔ اس صورت میں ان حکما کے لیے دہر کے لحاظ سے کسی شے کو حادث قرار دینا ممکن نہیں۔ اور کسی نے بھی حدوث دہری کا قول نہیں کہا۔ میر نے حادث کی دو قسمیں قرار دیں، ایک حادث دہری جو مسبوق بالعدم سبقاً دہریاً غیر متقدر ہو۔ یعنی جس سے پہلے عدم ہو، اور وہ بعد میں وجود میں آئی ہو۔ دوسری حادث زمانی جس کا وجود زمان خاص سے متعلق ہو اور جو زمان سابق میں معدوم ہو۔ ان دونوں قسموں کے مقابل قدیم ہے اور ممکنات سب کے سب ان کے نزدیک حادث دہری ہیں۔

میر باقر کے اس نظریہ سے جن حکمائے ہند نے اعتنا کیا ان میں ملا محمود جونپوری (ف ۱۰۶۲ء) کو تقدم زمانی بھی حاصل ہے۔ کیونکہ میر و ملا تقریباً معاصر بھی تھے، پھر ان کے اعتنا و اختلاف کی نوعیت بھی اپنے متاخر علمائے ہند سے مختلف ہے۔ متکلمین کے برخلاف ملا محمود جونپوری قدم عالم کے قائل تھے۔ اس لیے متکلمین ہند سے حدوث دہری پر ان کی تنقید کا رنگ مختلف ہے۔ انہوں نے میر باقر کے اس نظریہ پر اس اسلوب سے تنقید کی ہے کہ اس سے قدم عالم کا اثبات ہوتا

ہے۔ قدم عالم پر فلاسفہ کے دلائل بڑے بودے تھے۔ متکلمین نے ان کے مسلک پر نہایت قوی اور ناقابل تردید شبہات قائم کر کے حدوث عالم و حدوث زمان کا اثبات دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے کیا تھا۔ ملا محمود نے حدوث دہری کے ابطال کے پردے میں قدم عالم کے اثبات کی راہ نکالی۔

ملا محمود کے علاوہ میر باقر داماد کے نظریہ پر ملا نظام الدین سہالوی (ف ۱۱۶۱ھ) ملا کمال الدین (ف ۱۱۷۵ھ) بحر العلوم عبد العلی (ف ۱۲۳۵ھ) امام فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ) علامہ عبد الحق (ف ۱۳۱۶ھ) مولانا برکات احمد (ف ۱۳۴۷ھ) نے معیت دہریہ اور حدوث دہری کے نظریہ پر مفصل و مدلل گفتگو کی ہے اور قدم زمان، حدوث دہری اور معیت دہریہ کو باطل ثابت کیا ہے۔

مولانا معین الدین کے اس مقالہ کی ایک تو اہمیت اس کے موضوع کی وجہ سے ہے۔ مسئلہ زمان و دہر ہزاروں سال سے ایشیا و یورپ کے فلاسفہ و حکماء کے فکر و نظر کی جولانیوں کا ہدف رہا ہے، اور اس لیے یہ طبیعیات و مابعد الطبیعیات کا ہر دور میں ایک مہتم بالشان اور معرکہ آرا مسئلہ رہا ہے لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس مقالہ کو مزید اہمیت حاصل ہے۔

یہی حال علامہ اقبال کا ہے کہ ان کے مشہور عالم خطبات میں برصغیر کے فضلائے معقولات اور متکلمین میں سے (باستثناء جناب شاہ) کسی ایک کا بھی کسی بھی حیثیت سے نام آپ کو نہیں ملے گا۔

اللہ کرے، برصغیر میں علم کلام کے ارتقا اور متکلمین کا بسوط تذکرہ ترتیب دینے کی مہلت میسر آجائے تو ان ناانصافیوں کی کسی حد تک تلافی ہو سکے۔

تو عرض یہ کیا جارہا تھا کہ مولانا کے اس مقالہ کی اس پہلو سے بھی خصوصی اہمیت ہے کہ متاخرین متکلمین ہند کی عظمت مقام اور رفعت منزلت کا اس مقالہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مسئلہ زمان و دہر جیسے مہتم بالشان اور معرکہ آرا مسئلے میں فرنگی محل و خیرآباد کے ان فراموش کردہ و مظلوم فضلاء نے کس باریک نگاہی کے ساتھ کتنی گہرائی میں جاکر کلام کیا ہے۔ ان کی فکر میں اجتہاد رائے میں انفراد، نظر میں وسعت، دلائل میں قوت اور بات میں وزن ہے، وہ جب ابن سینا، فارابی، طوسی، دوانی، صدر شیرازی، میر باقر داماد، شیخ مقتول، جیسے عاظم فلاسفہ و اکابر حکما کے رد و ابطال پر آتے ہیں، تو اپنے دلائل و براہین کی ضرب قیم سے ان کے مسالک و نظریات کے ایوان کو متزلزل کر کے چھوڑتے ہیں۔

مصر اور یورپ میں فلسفہ کی جو تاریخیں لکھی گئیں ہیں، ان میں تو بھلا ان فضلا کو بار ملتا ہی کیوں، رہی اردو تو اس زبان میں یا تو وہی مصر اور یورپ کے مورخین کی کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں یا مستقلاً لکھا بھی گیا ہے تو انہی مصری و فرنگی ماخذ و مصادر سے استفادہ کر کے کسے پڑی تھی کہ شمس بازغہ، الجواہر الغالیہ، ہدیۃ الہدیہ، سلم العلوم، مرقات، شرح مرقات اٹھا کر پڑھتا اور ان ہندی نژاد فلاسفہ و متکلمین کے نبوغ و کمال کی بہار دیکھتا اور طبیعیات و مابعد الطبعیات میں ان کے مجتہدانہ انداز فکر اور بے باکانہ اسلوب بیان کا نظارہ کرتا اور پھر فلسفہ و کلام کی تاریخ میں فلاسفہ ہند کے ایک باب کا اضافہ کرتا۔

خدا جزائے خیر دے مولانا معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جنہوں نے ایک مسئلہ (زمان) میں ان مظلوم اور زیب طاق نسیان فضلا کے انداز گفتگو اور زور استدلال کی بہار ہمیں دکھادی۔

حواشی:

(۱) اس رسالہ کے علاوہ الحجۃ البازغہ (مطبوعہ مجلس اشاعت العلوم دکن) کے ۵۲۰ صفحات میں سے ۲۳۳ صرف اسی بحث کے مخص کئے گئے ہیں۔ پھر اپنی آخری اور معرکہ آرا تصنیف معارف الہیہ (مخطوط) میں اس سے بھی زیادہ شرح

وبسط اور زور کے ساتھ ہفوات فلاسفہ کی تغلیط و تردید فرمائی گئی ہے۔

(۲) مکتوب نمبر ۸۳، صفحہ ۵۰ اقبال نامہ

(۳) عبدالشاہد شروانی نے وہ خطوط ملاحظہ فرمائے تھے بعد میں ضائع ہو گئے۔

(۴) یہ مکمل مقالہ ماہنامہ ریاض کراچی شمارہ ۲ جلد ۴ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۵) قدم ذاتی :۔ کسی شے کا اپنے وجود میں دوسری کا محتاج نہ ہونا۔ حدوث ذاتی :۔ کسی شے کا اپنے وجود میں دوسری شے کا محتاج ہونا۔ قدم زمانی ۔ کسی شے کے وجود سے پہلے عدم کا نہ ہونا۔ حدوث زمانی، کسی شے کے وجود سے پہلے عدم کا ہونا۔

(۶) مولانا روم۔ امام غزالی

(۷) حالانکہ شاہ ولی اللہ محدث بھی تھے، فقیہ بھی، مفسر بھی، مجدد بھی، مگر متکلم نہ تھے اور اسی لیے مولانا نے ان کی جس کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو علم کلام کی کتاب بتایا ہے وہ بھی خود شاہ صاحب کی نظر میں صحیح نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے اس فن کو علم اسرار الدین کا نام دیا ہے۔

علم و معلوم

مولانا کا یہ رسالہ (۱) بھی فلسفہ کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ علم پر ہے۔ علم و معلوم کا مسئلہ قبل مسیح کے یونانی فلاسفہ سے لے کر عہد سقوط دہلی کے اسلامی فلاسفہ کے درمیان مسلسل و متصل معرض

بحث و گفتگو رہا ہے۔ مشائیہ، اشراقیہ، متکلمین اور صوفیا برابر اس موضوع پر داد تحقیق دیتے رہے ہیں اور اس طرح صرف ایک مسئلے کے سلسلے میں ہزاروں مسائل پیدا ہو گئے، ہزاروں عقدے کھلے اور صدہا اسرار و نکات زبان قلم پر آ گئے۔

مولانا کے اس مقالہ کی اہم خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ سے فلسفہ و حکمت کے ارتقا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور خصوصاً متاخرین فلاسفہ کے جرات مندانہ طرز فکر اور بے باکانہ طرز اظہار کی ایک جھلک ہمیں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

جس جس مرحلہ بحث و کلام پر خود مولانا اپنے آرا و افکار کا اظہار فرماتے ہیں وہاں ان کا انداز کلام، فلاسفہ عالم میں ان کے ممتاز و نمایاں مقام کو متعین کرتا ہے۔ وہ جب افلاطون، شیخ مقتول، میر باقر داماد، شیخ الرئیس، فارابی، محقق دوانی، میرزاہد، محقق طوسی، غرض مشائیہ، اشراقیہ، معتزلہ، قدما، متاخرین میں سے کسی کے مسلک کا رد و ابطال فرماتے ہیں، تو جس اعتماد جس وقار اور جس شان خود شناسی کے ساتھ آغاز کلام کرتے، تبئین مسلک کرتے، قطع دلیل کرتے اور خود برہان قائم کرتے ہیں وہ فلسفہ کے مختلف مکاتب اور امہات کتب پر ان کی

نظر کی وسعت اور گہرائی کا نشان دہی کرتا ہے۔

ہم ذیل میں مولانا کے نقد و نظر کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

علم کے معنی میں متقدمین و متاخرین کے متعدد (۲) مسلک و مذاہب ہیں۔ جن میں سے سات مسالک کو مولانا نے قابل اعتنا قرار دے کر ان پر کلام کیا ہے۔ پہلے تعیین مذاہب کی ہے، پھر منشا کے اختلاف معانی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان مذاہب پر تنقید کی ہے اور آخر میں مذہب حقہ (مسلک متکلمین) کی تصویب و تائید کی ہے۔ ساتھ ہی متعدد ذیلی مسائل پر مفصل و مدلل بحث کی ہے۔ مثلاً۔

علم، مقولات عشر (قاطیغوریاس) (CATIGORYS) میں سے کس مقولے سے ہے۔

علم کے متعلق مذاہب بلحاظ معلوم

علم حقیقت واحدہ ہے یا نہیں؟

علم باری تعالیٰ۔

علم کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ۔

الاضافۃ الحاصلۃ بین العالم والمعلوم ہے۔ یعنی علم اس نسبت کا نام ہے جو عالم اور معلوم کے درمیان قائم ہوتی ہے۔ اس پر مولانا نے تین اعتراض وارد کیے ہیں۔ ان تین میں سے دوسرا اعتراض

یہ ہے کہ:۔

علم اگر اضافت سے عبارت ہے تو لازم آتا ہے کہ معلوم ہمیشہ موجود و متحقق ہو۔ حال آنکہ علم ان اشیاء کا بھی ہوتا ہے، جو خارج میں معدوم ہیں، کیونکہ اضافت نسبت ہے اور ہر ایک نسبت اس امر کو چاہتی ہے کہ اس کے ہر دو منتسب خارج میں موجود ہوں۔ (۳)

تیسرا اعتراض:۔

عالم اور معلوم کے درمیان جو اضافت حاصل ہوتی ہے وہ تحقق عالم و معلوم کے بعد ہوتی ہے۔ اور عالم کا عالم ہونا اور معلوم کا معلوم ہونا بعد قیام علم متصور ہے۔ پس علم کو اضافہ بین العالم والمعلوم پر دو درجے تقدم ہے۔ (اور تم علم کو اضافہ سے ہی تعمیر کر رہے ہو) (۴)

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

اسی (ضعف و سخافت کی) وجہ سے محققین متکلمین میں سے کسی نے علم کو اضافت کے قبیل سے

نہیں کہا ہے۔ اس قول کی نسبت امام رازی کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن یہ ان پر افترا ہے۔ البتہ انہوں نے بر سبیل جدل صورت کو باطل کرتے ہوئے شرح اشارات میں یہ کہا ہے کہ "علم جب صورت نہیں ہے تو پھر خواہ اضافت ہی ہو" اس سے معلوم ہوا کہ وہ اضافت پر دل ہنہاد نہیں ہیں۔ بطور احتمال اس کا ذکر کیا ہے (۵)

اب علم باری تعالیٰ جل شانہ کے سلسلے میں مولانا کی ایک بحث لطیف کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ جس سے آپ کو نام نہاد عقلائے یونان و روم اور مسلمانوں میں سے ان کے زلہ ربا "حکما" (مشائیہ) کے ہفوات اور ان کے مقابلہ میں حکمائے اسلام اور متکلمین دین متین کی ایمان افروز نکتہ آفرینی و باریک بینی کا اندازہ ہو گا۔

یونان میں جہلا کا ایک ایسا گروہ بھی تھا جو سرے سے باری تعالیٰ کے علم ہی کا منکر تھا۔ اپنے اس انکار پر فلسفہ کی اصطلاحوں کا سہارا لے کر جو دلیل ان جہلہ نے تراشی تھی وہ بظاہر "فلسفیانہ" سہی مگر دراصل بڑی مضحکہ خیز اور جاہلانہ تھی۔ ان کا کہنا تھا:۔

باری تعالیٰ واحد محض ہے۔ اگر وہ اپنی ذات کو جانے گا تو ذات حق عالم بھی ہو گی اور معلوم بھی۔ اس طرح ذات میں تغایر و اثنینیت پیدا ہو جائے گی، کیونکہ مصداق عالم اور مصداق معلوم دو علحدہ علحدہ ذاتوں کو ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دونوں میں تضائف (باہم اضافت) ہوا، اور تضائف تقابل کی ایک قسم ہے۔ لہذا باری تعالیٰ کا علم بذاتہ تغایر و اثنینیت کا مقتضی ہوا۔ حال آں کہ باری تعالیٰ واحد محض ہے، لہذا اس کو اپنی ذات کا عالم نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ واحد محض نہیں رہے گا اور جب وہ خود اپنی ذات کا عالم نہیں ہوا تو دوسری اشیاء کا عالم کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ دوسری اشیاء کا علم فرع ہے اپنی ذات کے علم کی۔

اس فلسفیانہ انکار کا جواب فلسفہ کی روشنی میں دیا جانا چاہیئے۔

چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

یہ لغو اور بے ہودہ شبہ ہے۔ اس وجہ سے کہ اپنی ذات کا علم، علم حضوری ہے نہ کہ حصولی اور باب اضافۃ سے علم حصولی ہے نہ کہ علم حضوری۔ علم

حضوری میں عالم، معلوم، علم سب ذاتاً و اعتباراً ایک ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی تغایر و اثنینیت نہیں ہوتی اور علم الشئی بذاتہ علم حضوری ہوتا ہے۔ چنانچہ علم واجب بذاتہ بھی علم حضوری ہوا جو اضافت و نسبت سے منزہ ہے۔

یہ فلاسفہ یونان کے ایک گروہ کی ہرزہ سرائی تھی۔ اس سے بھی فی الجملہ اعتنا ضروری تھا۔ چنانچہ کیا گیا۔

باقی تمام حکما (۶) کا اس پر اتفاق ہے کہ باری تعالیٰ عالم ہے، وہ باری تعالیٰ کے لیے علم فعلی و علم انفعالی دونوں کے قائل ہیں۔ لیکن علم فعلی کے اثبات میں دشواری یہ پیش آئی کہ علم فعلی بحیثیت علم کے اس کا مقتضی ہے کہ علم کے وقت معلوم موجود ہو۔ ورنہ علم کا تعلق معدوم محض سے لازم آئے گا۔ جو باطل ہے کیونکہ علم صفت ذات اضافت اور اضافت کے لیے متضائفین کا وجود ضروری ہے۔ لیکن یہی علم فعلی بحیثیت فعلی ہونے کے اس کا مقتضی ہے کہ علم وقت معلوم موجود نہ ہو۔ ورنہ علم علم فعلی نہ رہے گا۔ اس مشکل کو سب ہی نے اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی سعی کی ہے۔

افلاطون الٰہی کا مذہب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو اشیاء کا علم بواسطہ

صور علمیہ ہوتا ہے جو قائم بالنفسہا ہوتی ہیں۔

معلم ثانی ابو نصر فارابی اور معلم ثالث ابو علی بن سینا کا مذہب یہ ہے کہ اشیاء کا علم بواسطہ صور علمیہ ہوتا ہے جو باری تعالیٰ میں قائم نہیں یہ صور علمیہ مثل صفات باری تعالیٰ قدیم ہیں۔

نصیر الدین طوسی (۶۷۲ھ) کے نزدیک علم فعلی بواسطہ صور ہے لیکن وہ صور کو اول الصوادر (عقل اول) میں قائم مانتے ہیں۔

عامہ متاخرین علم باری کو علم حضوری مانتے ہیں، یعنی باری تعالے اشیاء کو قبل ایجاد عالم محض اپنی ذات سے براہ راست جانتا ہے۔ علم بالعلۃ ان کے نزدیک علم بالمعلول کو متلزم ہے۔ صور کے واسطے کی یہاں ضرورت نہیں۔

محقق جلال الدین دوانی (ف ۹۰۸ھ) نے وجود ممکنات کی دو قسمیں کیں۔ ایک وجود اجمالی دوسرے وجود تفصیلی اور علم فعلی کے ساتھ وجود اجمالی مخصوص کر دیا۔

میر محمد زاہد ہروی (ف ۱۱۰۲ھ) بھی علم فعلی کو علم حضوری کہتے ہیں۔ یعنی ممکنات و اشیاء باری تعالیٰ کو بلا وساطت صور علمیہ معلوم ہیں۔

فرقہ معتزلہ اور بعض صوفیہ کا قول ہے کہ ازل میں اشیاء ممکنہ

موجود نہ تھیں۔ بلکہ ثابت تھیں، موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان کا علم فعلی ہو گیا اور ثابت ہونے کی وجہ سے علم کا تعلق معدوم محض سے نہ رہا۔

عامہ صوفیہ کرام کا مذہب و مسلک یہ ہے کہ ممکنات و موجودات میں سے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے۔ موجودہ حقیقی صرف ذات باری عزاسمہ ہے۔ تمام ممکنات اس کے اظلال و اعراض انتزاعیہ کی طرح ہیں۔ سب کی موجودیت کا منشا ذات حق سبحانہ ہے۔ اول میں ذات باری کا علم اپنی ذات کے لیے در حقیقت تمام کائنات کا علم ہے۔ کہ جو اس کے اظلال و آثار ہیں۔

باری تعالیٰ کے علم فعلی کے اثبات کے سلسلے میں مختلف مذاہب و نظریات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مولانا بڑی تفصیل، بڑے زور بڑے اعتماد کے ساتھ ان پر تنقید بھی فرماتے گئے ہیں۔

پہلے افلاطون الہیٰ کے نظریہ پر مولانا کی تنقید ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا نے اس نظریہ پر آٹھ اعتراض وارد کئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صور علمیہ جن کے واسطے سے باری تعالیٰ کو اشیاء کا علم ہوتا ہے واجب ہیں یا ممکن؟ اگر واجب ہیں تو

تعدد وجبا ہو گیا جو باطل ہے اور اگر ممکن ہیں تو ان کا علم فعلی جب ہو سکتا ہے کہ ان کے وجود سے پہلے ان کا علم ہو۔ اب اگر ان صور کا علم دیگر صور علمیہ کے واسطے سے ہے تو ان کے متعلق بھی یہی سوال پیدا ہوگا اور اس طرح تسلسل لازم آئے گا اور اگر ان صور کا خود بھی صور ہیں تو ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ کہ جن ممکنات کے یہ صور ہیں انہوں نے کیا قصور کیا ہے کہ براہ راست علم واجب ان کے ساتھ متعلق نہ ہو سکے اور صور کے ساتھ متعلق ہو جائے۔

حواشی

(۱) ماہنامہ "بینات" کراچی جلد ۳، نمبر ۴ شمارہ ۶،۱،۲،۳، (بابت ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ و محرم و صفر و ربیع الاول ۱۳۸۴ھ

(۲) تیرہ

(۳) ماہنامہ بینات کراچی، ربیع اولال ۱۳۸۴ھ صفحہ ۱۴۰

(۴) حوالہ بالا

(۵) حوالہ بالا

(۶) صرف شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول ۵۸۸ھ اس باب میں منفرد ہیں۔ وہ باری تعالیٰ کے لیے نفس علم کے منکر تو نہیں ہیں لیکن علم فعلی کے منکر ہیں۔ اور علم فعلی چونکہ ایک صفت کمالیہ ہے اور ذات مستجمع

جمیع کمالات سے ایک صفت کمالیہ کی نفی ہوتی تھی اس لیے یہ نکتہ پیدا کیا کہ سمجھ کر پیدا کرنا اگر کمال ہے تو بغیر غور و فکر عالم کو پیدا کر دینا اس سے بھی زیادہ کمال ہے۔ لیکن شیخ مقتول یہ نہ سمجھے کہ غور و فکر اور شے ہے اور جہل اور شے ۔۔ انہوں نے تو ذات باری سے علم فعلی کا انکار کر کے جہل تسلیم کیا ہے۔ عیاذاً باللہ

رسائل متفرقہ

مولانا کی زندگی اگرچہ بیک وقت ایک مجاہد حریت مدرس اور صاحب قلم کی زندگی تھی، انہوں نے فراغت درس (۳-۱۹۰۴ء) کے فوراً بعد ہی (۱) باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں ان کی قلمی کاوشوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۲۱ء میں انہوں نے وادی سیاست میں اقدام شروع کر دیا تھا۔ اور پھر آخری لمحات حیات تک یہ تینوں مشغلے تقریباً ایک ساتھ چلتے رہے۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ مختلف حوادث و داعیات کی بنا پر کسی دور میں ان کی دلچسپیاں کسی ایک طرف زیادہ رہیں۔ مثلاً ذہین و طباع طلبہ جمع ہو گئے تو اب مولانا مسند درس کے ہو کر رہ گئے ہیں اور صبح سے رات گئے تک اسباق کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور وہ ہیں، ملک کے سیاسی ہنگاموں نے دعوت دی تو مولانا نے فوراً لبیک کہی اور جلسوں، تقریروں اور دوروں میں کھو گئے۔ چنانچہ ان

کی زندگی کو اگر ان مشاغل میں سے کسی ایک کی طرف متجاوز رجحان کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیں تو وہ تقسیم یوں ہو گی:۔

۳-۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۶ء تک خالص معلمانہ سرگرمیاں رہیں۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک خالص تدریس کے ساتھ قلمی مشاغل بھی رہے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک تدریس و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر وقت اور قویٰ کا بڑا حصہ سیاسی مسائل کی عقدہ کشائی میں بھی صرف ہوتا رہا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا حج بیت اللہ اور زیارت مرقد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شرف اندوز ہوئے۔ سفر حرمین سے مراجعت کے بعد مرض ذیابطیس کی پرانی شکایت نے شدت اختیار کر لی۔ پھر ۱۹۳۵ء میں سرطان پشت جیسے صعب العلاج اور اذیت ناک مرض میں مبتلا ہو گئے اور جراحی کے ایک طویل عملیہ (۲) کے بعد صحت یاب ہوئے۔ مگر قویٰ کا اضمحلال اور طبیعت کا ضعف روز بروز بڑھتا گیا اس لیے ملکی سیاسی سرگرمیوں سے بڑی حد تک معذور و یکسو ہو کر محض علمی مشاغل میں ہمہ تن اور ہمہ جان منہمک ہو گئے تھے۔

مانچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

چنانچہ سب سے زیادہ تحریری سرمایہ انہی آخری پانچ سال (۳۵

۱۹۴۰ء) میں فراہم ہوا۔

مذکورہ دو رسائل، ۱۔ رسالہ حدوث دہری، ۲۔ علم و معلوم کے علاوہ حسب ذیل رسائل (۱۹۳۶ء م ۱۳۵۵) میں تحریر فرمائے۔

۱۔ وجود

۲۔ جعل

۳۔ تشکیک فی الماہیات

۴۔ کلی طبعی

۵۔ مقسم تصور و تصدیق

۶۔ بحث متعلق تصدیق

۷۔ اختلاف در حقیقت تصدیق

۸۔ وجود رابطی

۹۔ الفرق بین الفرد التدریجی والحرکت التوسطیہ

۱۰۔ رسالہ الاستعارہ

مندرجہ بالا رسائل میں سے پہلے آٹھ رسائل منطق کے حصہ تصورات اور محب اللہ بہاری (ف ۱۹۱۹ ھ) کی مقبول و معروف تصنیف سلم العلوم اور اس کی شروح خصوصاً قاضی مبارک (ف ۱۱۶۲ ھ) کی مشہور عالم اور معرکہ آرا شرح اور اس شرح کے حواشی از امام

فضل حق خیر آبادی (ف ۱۲۷۸ھ) اور علامہ عبدالحق (ف ۱۳۱۶ھ) سے متعلق ہیں اور اردو میں ہیں۔ نواں رسالہ فن مایعم الاجسام کے معرکۃ آرا، اور مختلف فیہ مبحث پر ہے۔ دسواں رسالہ عربی میں ہے اور فن معانی میں ہے۔

حواشی:

(۱) ویسے تو دوران تعلیم میں ہی حکیم صاحب نے تعلیم کی ذمہ داری مولانا پر ڈال دی تھی، چنانچہ خیر آباد کے مشہور عالم و بزرگ شاہ مقبول میاں (جو آخر میں مجذوب ہو گئے تھے) حکیم صاحب کے علاوہ مولانا سے بھی درس لیتے تھے۔ اسی طرح اپنے برادر خورد غازی محی الدین صاحب (پیارے میاں مشہور خلافتی رہ نما) کی تعلیم بھی مولانا کے ذمہ تھی۔ علامہ عبدالحق خیر آبادی کے کے نبیرہ، گرامی مولوی حکیم ظفر الحق صاحب کو "تکرار" بھی مولانا اسی دور میں کرایا کرتے تھے۔

(۲) یوں تو مولانا کی پوری زندگی مشکل پسندی صعوبت کشی اور تحمل شدائد کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھی۔ مگر اس عملیہ کے سلسلے میں مولانا نے ضبط و تحمل کا مظاہرہ فرمایا۔ اس نے ہر دیکھنے اور سننے والے کو غرق حیرت کر دیا تھا۔ جراحت کار حسب معمول داروے بے ہوشی کا استعمال کرنا چاہتے تھے مولانا نے ان کی اس تجویز کو اس طرح حیرت کے ساتھ سنا ہے جیسے یہ کوئی

انوکھی تجویز ہو اور یہ فرما کر انکار کر دیا کہ آپ نشتر چلانے سے چند لمحے قبل مجھے بتا دیں ۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کسی نوع کی مزاحمت و مداخلت کی شکایت نہیں ہو گی ۔ چنانچہ ایک مسئلہ علمیہ کو موضوع فکر بنا کر ایسے کھوئے گئے کہ ڈاکٹر بڑے اطمینان سے دستکاری میں مصروف رہے ۔ اور بڑی دیر تک سرطان زدہ رقبہ کی بلکہ بر بنائے احتیاط صحت مند حصوں تک کی قطع و برید کرتے رہے مگر مولانا کو خبر نہ ہوئی ۔ ڈاکٹر سورج نرائن کا کہنا تھا کہ ہم نے ہزاروں آپریشن کئے مگر اتنا بڑا آپریشن بغیر بے ہوش کے آج تک نہیں کیا۔

حاشیہ ترمذی

مولانا مدت العمر درس حدیث کا خصوصی اہتمام والتزام فرماتے تھے ۔ حدیث کے اسباق بڑے ہی ذوق و شوق اور پابندی کے ساتھ پڑھاتے تھے ۔ دوران درس میں بعض مقامات پر تو وہ" بے قابو ہو جایا کرتے تھے ۔ آنکھوں سے غیر معمولی چمک سی پیدا ہو جاتی تھی ۔ پھر ان میں نمی جھلکنے لگتی پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے بالکل ہی چھوٹ جاتا اور اشکوں کا سیلاب امنڈنے لگتا ۔ اب یہ عالم ہوتا کہ تقریر کی روانی اور تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی اور لفظ و عبارت کے بجائے منہ سے چیخیں نکلنے لگتیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو جاتی ۔ اسی حالت میں بے ہوشی تک کی نوبت پہنچ جاتی ۔

صلوۃ و سلام ہو، ہزار بار صلوۃ و سلام ہو، بے شمار بار صلوۃ و سلام ہو، زندگی بھر صلوۃ و سلام ہو محمد عربی پر، بھلا ان کا ذکر جمیل ہو اور خواجہ معین الدین کے ہم نام وہم وطن مولوی معین الدین میں یہ تاب کہ وہ ہوش میں رہ سکے!

یہ تاب، یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

دیکھنے والے حیرت سے دیکھتے کہ ایک فقیہ ظاہر اور عالم شریعت کا پیکر رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا ہے اور پس منظر سے ایک سینہ چاک آتش بجاں، جنوں بسر اور آہ برلب صوفی کی تصویر ابھر رہی ہے ۔ مدرسہ خانقاہ میں تبدیل ہو گیا ہے اور زبان گویا کی جگہ چشم گریاں نے لے لی ہے ۔ گھنٹوں یہ عالم طاری رہتا ، نظام الاوقات درہم و برہم ہو جاتا محفل کا رنگ بدل جاتا ۔

ہاں تو مولانا کے یہاں درس حدیث کا خصوصی التزام و اہتمام ہوتا تھا ۔ وہ مسلکاً ماتریدی و حنفی تھے ۔ اس لیے مسلک امام اعظم کے اثبات کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور دلائل کا پورا زور صرف کر کے علمائے احناف کی حمایت و نصرت کا حق ادا فرماتے تھے ۔

مولانا کا حاشیہ ترمذی عنقریب شائع کیا جا رہا ہے ۔ جس پر ان تلمیذ سعید رشید اور برادر زادہ عزیز مولوی حکیم نصیر الدین ندوی نے

ایک مفصل و بسوط مقدمہ میں ان کے درس حدیث کی خصوصیت پر بسط و وضاحت کے ساتھ کلام کیا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس حاشیہ کے صرف ذکر خیر پر اکتفا کرتے ہیں۔

وفات

محرم ۱۳۵۷ھ میں مولانا کو وجع الورک کا عارضہ لاحق ہوا جس نے بعد میں یہاں تک طول کھینچا کہ جسم کا نصف اسفل مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اسی حالت میں درس و تدریس اور منطق و فلسفہ کے اہم معرکہ آرا موضوعات پر تقاریر املا کرائیں۔ تاج کمپنی کی فرمائش پر صحیح بخاری کے پارہ اول کا اردو میں حاشیہ تحریر فرمایا۔ خواجہ بزرگ کی ایک محققانہ سوانح حیات (۱) مرتب فرمائی۔ دارالعلوم (۲) بھی باقاعدگی سے تشریف لے جاتے رہے۔ لیکن عوارض کے اشتداد و امتداد سے قویٰ کا اضمحلال بڑھتا چلا گیا اور مرض غالب اور قوت مدافعت مغلوب ہوتی چلی گئی۔ بے پرہیزی بلکہ بد پرہیزی اور علاج دوا کی طرف سے غفلت بلکہ بیزاری سب پر مستزاد۔

بالآخر وہ وقت آپہنچا جو سب کے لیے آنا ہے۔

۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ م ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء کو مولانا معین الدین رحلت

فرما گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مولانا معین الدین وہ ہفوات فلاسفہ کے آخری نقاد، سرخیل گروہ متکلمین النبی الامی صلے اللہ علیہ وسلم کے معارف و علوم کے مبلغ و ناشر، سپاہ مجاہدین حریت کے شیر دل کمانڈر، ایک پاک باطن و صافی ضمیر و شیفتہ مزاج درویش، برکات احمد کے شاگرد منتخب الحق کے استاد، بزم قرطاس و قلم کی رونق، درس و افادہ کی روح رواں، فرنگی سامراج کے دشمن جاں، فروغ بدعات کی راہ کا سنگ گراں، دین میں تصلب و تشدد سے نفور / افراط تفریط کے اس دور میں خیر آبادی و برکاتی مسلک توسط و اعتدال کے ناشر و مناد۔

حواشی:

(۱) یہ کتاب مولانا کی وفات کے بعد ۱۳۵۹ھ میں نثار خواجہ کے نام سے طبع ہوئی۔

(۲) مدینیہ عثمانیہ مراد ہے۔ جس کے منتظمین ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں دوبارہ مولانا کو مجبور کر کے لے آئے تھے۔ مگر نظام دکن کی حکومت نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم کو پھر مولانا کی خدمات جلیلہ سے محروم کر دیا تھا۔

تلامذہ

- مولانا منتخب الحق
- مولانا خواجہ قمرالدین سیالوی (سیال شریف)
- مولانا حافظ پیر ہاشم جان سرہندی
- مولانا غلام مرشد (لاہور)
- مولانا محمد اسرائیل (پشاور)
- مولانا عبدالشاہد خاں شروانی
- مولانا سید نجم الحسن رضوی
- مولانا سید عبدالحی مودودی (اجمیر)
- مولانا حکیم محمد نصیرالدین ندوی
- مولانا مفتی محمد محمود الوری
- مولوی حکیم پیر سلیم جان سرہندی (ماتلی)
- مولانا ظہور احمد بگوی
- مولانا عبدالغفور (سوات)
- مولانا عبداللہ (جامعہ عباسیہ، بہاول پور)
- مولانا سید امیر
- مولانا ولی النبی
- مولانا مقصود علی خیرآبادی
- مولانا فتح محمد بہاول نگری
- مولانا شاہ مقبول میاں خیرآبادی